

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222493

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ۸۹۱۵۲۳۳۲ Accession No. ۱۵۳۳۸

Author کرشن چندر - ک

Title

This book should be returned on or before the date
last marked below. پورے

پوپ

کرشن چندر

مکتبہ سلطانی ممبئی

جلہ حقوق محفوظ

پہلا ایڈیشن..... دو ہزار..... ۱۹۶۶ء

قیمت: دو روپیہ

اشتر

مکتہ و سلطانہ

ابراہیم رحمت اللہ روڈ بی بی س

پریزینٹیشن سلطان حسین مالک سلطانہ خاتون آرٹس لیجووا اینڈ پرنٹنگ پریس بی بی س

شیخ محمد عبداللہ صاحب شیر کشمیر کے نام

10 442

فہرست

خلیہ صدارت

۱	پیش لفظ
۱۷	پوری بندر
۲۱	گاڑی میں
۵۰	حیدرآباد سٹیشن
۶۲	حیدر گورہ
۶۹	اجلاس
۸۶	پرانا محفل
۱۰۱	بطونوں کے ساتھ ایک شام
۱۰۹	واپسی
۱۲۳	منزل

خطبہ صدارت

کل ہند ترقی پسند مصنفین کانفرنس حیدرآباد دکن اکتوبر ۱۹۲۵ء

ترقی پسند ادیبوں کی یہ کانفرنس ایک نہایت نازک مرحلہ پر آئی ہے جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اور زمانہ مابعد جنگ کے تمام دقیق مسائل اٹھ بڑے ہیں میں اس موقع پر اس بنیادی سوال سے بحث نہیں کروں گا کہ ایک ادیب کو ان مسائل کو سلجھانے سے کیا حاصل یا اسے اس قسم کے جھگڑوں سے کیا سزاوار چوں کہ یہ کانفرنس اپنے ساتھیوں کے لئے ہے اس لئے میں اپنے لئے اور آپ کے لئے بھی ترقی پسند ادیب کی تمام مبادیات کو قبول کرنے لیتا ہوں۔ یہ کہ ادب کا زندگی ہو مگر تعلق ہے۔ اور جب زندگی اور اس کے شواہد و عوامل بدلتے ہیں تو ادب بھی بدلتا ہے یہ کہ ادب اور سیاست الگ نہیں ہو سکتے۔ یہ کہ ہر ادب مقصدی اور افادی ہوتا ہے وہ کس مقصد کے لئے لکھا جاتا ہے اور اس کا فائدہ کن جماعتوں کو پہنچتا ہے۔ یہ ادیب کی ذہنی اُفتاد طبع اور اس کے جماعتی رجحان پر منحصر ہے۔ یہ کہ جس طرح اقتصادی اور سماجی اور معاشی ادارے نظام زندگی میں بنیادی اختلافات پیدا کرتے ہیں اسی طرح وہ ادب پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور مختلف ادبی جماعتوں کو وجود میں لاتے ہیں۔ وہ جماعتیں جو ادب میں ایسی زبان استعمال کرتی ہیں جو عوام سے کوسوں دور ہے وہ جماعتیں جاگیر دارانہ نظام زندگی کے بچے کچے عناصر کے کیف



و نشاط کے لئے آراستہ ہیں۔ وہ جماعتیں جو ہر منزل پر سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے ساتھ رہتی ہیں اور پھر وہ جماعتیں جن کی نگاہ ماضی اور حال اور مستقبل کو ایک ہی لڑی میں پروئی ہوئی ہے یہ نگاہ تاریخ کا مطالعہ کرتی ہوئی؟ انسانوں میں ایک نئی تمدنی تہذیبی، سیاسی اور معاشی اشتراک کی داغ بیل ڈال رہی ہے ہمارے ارب میں یہ تمام جماعتیں مصروف کار نظر آتی ہیں اور ادیبوں کے مختلف گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان جماعتوں میں سے کسی ایک نہ ایک جماعت سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ موخرالذکر جماعت ترقی پسند ادیبوں کی ہے اور ہم لوگ اس لئے یہاں اکٹھا ہوئے ہیں کہ اپنے گروہ پیش کے حالات پر نظر ڈالیں اور اسکی روشنی میں اپنے لئے ایک صحیح لائحہ عمل مرتب کریں۔

پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کے نتائج میں جو نمایاں فرق مجھے معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس جنگ کے خاتمہ پر ہم اپنے جمہوری مقاصد کے زیادہ قریب آئے ہیں پورے ایشیا میں آزادی کی روح نوزائید ہوئی ہے۔

ایشیائی روس کے ادیبوں کے افکار میں اس بادۂ آہنگ کی گونج سنائی دیتی ہے جب قوم آزاد ہو جاتی ہے جب اسکے تہذیبی افق پر سے غلامی کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ جب اس کا مذہب غیروں کی ریشہ دوانیوں سے رہائی حاصل کر لیتا ہے اور جب اس کا سماج باہمی اشتراک کے اصولوں پر کار بند ہو کر ایک غیر خودی سے سرشار ایک بلند و بالا مستقبل کی طرف بے کھٹکے بڑھتا ہے سویشیا کے ادیبوں کے نئے پہاڑی جڑیوں کے چھپے میں وہ اپنے مستقبل کو ایسی طمانیت سے دیکھتے ہیں جو ابھی ہماری نگاہوں کو میسر نہیں۔ ہمیں ابھی اپنے سوسائے ہوئے سرخزاروں کو جگانا ہے اسکی خوابناک وادیوں کو گونجانا ہے۔ اپنے خزانے سیدھے چمن میں اس بہار کو تازہ کرنا ہے جسکی کہیاں ہمارے دلوں میں پھوٹ رہی ہیں، اور جس کا سنگیت ہماری روجوں میں نغمہ سنج ہے۔ جیسا کہ میں نے ابھی کہا پورے

ایشیا میں آزادی کی لہر جاری و ساری ہے۔ ایشیا ہی میں نہیں افریقہ میں بھی عربستان اور ایشیا کے لوگوں کا علاقہ اور خطہ بحر روم کے عرب علاقہ اور شام و لبنان میں یہ تحریک زور پکڑ چکی ہے۔ وہاں کے نئے ادیبوں کے افکار میں اور صحافیوں کی تحریروں میں یہی رنگ غالب ہے، یہی آواز ہر جگہ سے بلند ہو رہی ہے، نعرہ آزادی، حق خود ارادیت اور مغربی استعماریت سے نجات اور دیوار رنگے نسل و خون کے خلاف ایک شدید احتجاج جو مغربی افریقہ کے نیگرو ادیب ہیں ان کی تحریروں میں بھی آپ کو آزادی کے متعلق اسی سبس اور بیقراری کا پتہ چلتا ہے۔ زنجیروں کو ٹوڑ دینے کی آرزو ہے۔ خود نئے ایرانی ادیبوں خصوصاً آذربائیجان کے علاقے کے ادیبوں میں جو ہسٹری کی فلسفہ سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ ساقی و مینا و جام کا بہت کم ذکر ہے اسلئے کہ جب ساقی فطرت سے مر جائے اور شراب میں زہر ملا دیا جائے اور جام تا تجھ سے چین جائے تو نغمے کی نوعیت بدل جاتی ہے، جی جانتا ہے بیمار بھر آجائے۔ شہد آگین ہونٹ پھر مسکرانے لگیں۔ اور آنکھوں میں سنی کے کنول کیلئے لگیں۔ لیکن جب ادیب دیکھتا ہے کہ یہ بیمار سانسٹی ادب میں ممکن نہیں تو وہ ہسٹری کی ادب کی تخلیق پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس نظام زندگی کی تخلیق پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس نظام زندگی کی تخلیق پر جہاں ٹراکٹروں کی کاوش سے زمین زمین اگلنے لگتی ہے اور فارم اور کارخانے مزدوروں اور کسانوں کی یا بھی ہسٹریک سے چلتے ہیں اور رنگ کا ہر فرد اپنے مستقبل کو اپنے ہاتھوں میں محفوظ سمجھتا ہے۔

پچھلی جنگ میں ایسا نہیں ہوا تھا کم از کم اس حد تک جتنا کہ لڑائی آگے نہیں بڑھی تھی۔ اس وقت مختلف استعماری قوتوں کی ٹکر تھی۔ ایسی قوتیں جن میں سے چند ایک مخالف جماعتوں کے مقابلے پر زیادہ ترقی پسند جمہوری اداروں کی حامل تھیں۔ پھر بھی گزشتہ جنگ نے انقلاب روس کو جنم دیا اور ہسٹری کی فلسفہ کو

فلسفے کی حدود سے نکال کر عمل کا جامہ پہنایا۔ اور ادھر استعماری علاقوں میں انقلابی قوتوں کو مضبوط کیا اور نوآبادیات کے باشندوں میں آزادی اور اس سے متعلق خیالات کی ترویج کی لیکن اس جنگ میں جنتا کی لڑائی اور آگے بڑھی ہے۔ اب کے مقابلہ صرف استعماری قوتوں میں نہ تھا۔ اب کے مقابلہ اشتراکیت اور فاشیسم میں تھا۔ برطانیہ اور امریکہ کی نیم استعماری نیم جمہوری حکومتوں نے بھی حق راہیت اور "چار آزادیوں" یعنی "فور فرڈمس" کے نام پر یہ لڑائی لڑی ہے اور اپنے ملکی عوام کے سامنے بار بار انہیں خیالات کی اشاعت کی تاریخ لے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ فاشیت کے مقابلہ میں اشتراکیت کا ساتھ دیں اور اس طرح سے خود ہی استعماریت اپنے ہاتھوں استعماریت کے ہاتھ کڑو کرے جتنا پچھ اس جنگ میں جہاں فاشیت کو مکمل شکست ہوئی ہے وہاں استعماریت کی مستحکم دیواریں بھی بل گئی ہیں۔ ہندوستان سے نیکر با پنجوریاتک اور آزادی کے جذبے کی پشت پناہی کے لئے دُنیا بھر کی ترقی پسند جماعتوں کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ اس میں دیوار رنگ و نسل کی تفریق بھی نہیں ہے۔ اگر اٹل و چائٹا میں حریت کا نعرو بلند ہوتا ہے تو فرانس کی تحریک مقاومت اور وہاں کے اویب اس کا خیر مقدم کرنے میں۔ اگر جاوا میں ایشیائی آزادی چاہتے ہیں تو آسٹریلیا کے ہیریزن گورسے مزدوران اسلحہ جات کو جہازوں میں بھرنے کے لئے انکار کر دیتے ہیں جو تا ترقی پسند جماعتوں کی طرف سے اس تحریک کو کچلنے کے لئے جاوا میں بھیجے جا رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ایشیا میں اور امریکہ میں جنتا کی لڑائی کو اور بھی تقویت پہنچانی چاہئے اور اس RESISTANCE MOVEMENT کا جو مرکز ہے نیکر ہند چین تک ایک آگ کی طرح پھیلتی جا رہی ہے خیر مقدم کرنا چاہئے۔ اسے اپنی تحریکوں میں ایک نمایاں جگہ دینا چاہئے تاکہ نوآبادیات کا غیب انسان دبا ہوا، کچلا ہوا انسان ایک ہمت

رجعت پسندی کا مجنونانہ رقص پہلے سے بھی زیادہ ہلاکت خیزی لئے ہوئے ہے پہلے اگر انگریزی سامراج مہمان وطن کو پھانسی کے تختوں پر لٹکا کر ہنتوں پر گویاں چلا کر اور بے گناہوں کو گرفتار کر کے آزادی کی تحریک کو دبانے کی کوشش کرتا تھا تو آج ہندوستانی سرمایہ داروں اور جاگیر داروں اور نفع خوروں کے دو

متضاد گروہوں کی آڑ لیکر اور اپنے مکروہ چہرے پر نقاب ڈاکر وہ ملک میں خانہ جنگی کی آگ بھڑکانا ہے تاکہ انقلابی عوام متحد ہو کر اس سے مڑنے کے بجائے پس میں دست و گریباں ہو جائیں اور اس طرح سامراجی طاقت اور ہندوستانی رجعت پسند مفاوفا ہونے سے بچ جائیں۔

سیاسی مجاذ پر اگر خانہ جنگی کے حربے سے انگریز بھی شکست دینا چاہتے ہیں۔

تو تہذیبی اور ادبی مجاذ بھی ان کے اور ان کے ساتھ مل جانے والے ہندو اور مسلمان فرقہ پرست امیروں کے خطرناک حلوں سے محفوظ نہیں ہے۔ ترقی پسندوں کی تحریک کے لئے سب سے زیادہ تشویشناک امر یہ ہے کہ پڑھے لکھے درمیانی طبقے میں فرقہ پرستی کا زہر تیزی سے پھیل رہا ہے اور بہت سے وہ لوگ بھی جو آپے اگوارا دی خواہ سمجھتے ہیں۔ انگریزوں سے پہلے اپنے ہم وطنوں سے لڑنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ سیاسی حقیقت مینی کے فقدان کے ساتھ ساتھ معمولی انسانیت اور معمولی شرافت

تک کو بھلا دینا ان لوگوں میں عام ہوتا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس فضا میں جہاں انسانیت کی بنیادی قدروں اور ابتدائی مفروضات کو پیروں سے کھچلا جائے۔ ترقی پسند ادیبوں کا کام بہت دشوار ہو جائے گا۔ اور انہیں کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ لیکن سستی مقبولیت کے لئے ہم نے کبھی اپنے مولوں کو ترک نہیں کیا

آج تو اسکی اور ضرورت ہے کہ مسلمان اور ہندو فرقہ پرستی کے اس طوفان میں ہم انسانیت کے اس ہمہ گیر نصب العین کو جو مذہب اور فرقوں کی تفریق کو بیکار اور نقصان دہ سمجھ کر عالم گیر انسانیت کی برادری اور مساوات پر قوم کی آزادی اور اشتراکیت کے اصول کو اپناتا ہے جو ملک کی خانہ جنگی کو انگریز سامراجیوں اور ہندوستانی سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی ایک نخس سازش تصور کرتا ہے اور جو ہند مذہب و ملت اور فرقے کے محنت کش عوام اور درمیانی طبقے کے باہمی انقلابی اتحاد کو ہندوستان کی انقلابی جدوجہد کی کامیابی اور مستقبل کی معاشرت کی کنجی سمجھتا ہے۔ اپنی ادبی تخلیقوں میں زیادہ سے زیادہ اور مختلف پہلوؤں سے پیش کریں۔ میری رائے میں اسوقت ہندوستانی ادیبوں سے ترقی پسندی کا یہ سب سے اہم تقاضہ ہے۔ جو شخص بھی پودے، پڑھے گا وہ ہم سے اسکی توقع کریگا اور مجھے تو اس کا یقین ہے کہ جیسے اور بہت سے مراحل ترقی پسند کام نے طے کئے اسی طرح اس موقع پر بھی ان کی قلم اور انکی زبانیں حرکت میں آئیں گی۔ اور یہی ترقی پسند کام کے ارتقاء کی ضمانت ہے۔

(سید) سجاد ظہیر

بھئی - نومبر ۱۹۴۶ء

پیش لفظ

کیسی سخت ہوگی وہ زمین جہاں دس سال کی مسلسل عورتی زندگی کے بعد پودے
 آئیں۔ اور کیسا سخت جان ہوگا وہ بیج جس نے دس سال تک مٹی، دھول اور کچڑ میں
 اتنے پتے ہونے کے باوجود ارتقا کی طاقت ضائع نہ ہونے دی۔ یہاں تک کہ اس کا سبب
 جان ہوا اور اس میں سے سے نئی زندگی کی نرم و نازک وریشیں سبز کوئلیں پھڑپھڑیں
 ترقی پسند ادب کی تحریک کو شروع ہوئے دس سال ہو گئے۔ ۱۹۳۶ء سے
 ۱۹۴۶ء تک، دور آج ہم ان بودوں پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ جن کی تصویر کرشن چندر نے
 اتنے دلگداز، تعاش اور لطیف احساس کے ساتھ کھینچی ہے۔ یہاں اس تصویر میں
 شخصیتیں فروغی ہیں۔ ان کے افعال، دلچسپ طرح سے پیش کئے جانے کے باوجود
 معمولی ہیں۔ ان کی صورتیں وہ تو معمولی سے بھی کچھ کم ہیں اور ان کے کردار خطا و
 نسیان کے مرکب میں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کسی آتشیں تصور سے یہ ساری محض کہہ
 کسی اجتماعی جذبے کی حرارت نے اس میں سوز و ساز بھر دیا ہے۔ اور کسی شہرہ نامہ
 وجدان نے ساری فضا میں سرخ کپ کیا ہٹ پیدا کر دی ہے۔

ترقی پسند کا لفظ کس قدر سپاٹ، کتنا غیر شاعرانہ، کتنا ٹھنڈا ہے اور اُس مفہوم کے لئے کتنا ناموزوں، جو اس سے وابستہ ہو گیا ہے۔ مگر اس دس سال میں وہ تصور جو اس لفظ سے وابستہ ہے، ایک انجمن، اور انجمن ایک تحریک کی شکل آخر کیسے اور کیوں اختیار کر گئے؟

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں۔ جب دو تین نوجوان ایک اعلان نامہ کا مسودہ لے کر ادھر ادھر دڑتے پھرتے تھے پریم چند جوش اور عبدالرحمن نے دستخط کے تو ہم سمجھے کہ بہت بڑی کامیابی ہوئی۔ اسکے بعد جب لکھنؤ میں ہماری پہلی کانفرنس ہوئی رفاہ عام ہال میں بڑی مشکل سے ہم نے دو ڈھائی سو روپے جمع کئے تھے رات بھر سارے شہر کی دیواروں پر کانفرنس کے ہشتہار چسپاں کئے تھے اور تھکے ہارے کانفرنس کے ہال میں صبح سویرے سے ہی پہنچ گئے تھے کہ شاید ایسا نہ ہو پندرہ بیس آدمیوں سے زیادہ اس میں شریک بھی نہ ہوں۔ گھنٹے دو گھنٹے ٹکٹ سے داخلہ کا ہول جاری رکھنے کے بعد کانفرنس میں شرکت عام کی اجازت دیدی تھی۔ تاکہ کم از کم غریب طالب علم تو شریک ہو جائے۔ سارے ہندوستان سے کل پندرہ بیس ڈیلی گیٹ آئے تھے کافی گھبرائے ہوئے اور پریشان تھے ہم انہوں! بہت چھوٹا سا ڈانس تھا۔ اور صدر کی میز اور کرسی پرانی اور بوسیدہ تھی۔ دو ہی کرسیاں اوپر تھیں ایک پر پریم چند بیٹھے، اور دوسری پر حسرت موہانی۔ رفتہ رفتہ مال بھر گیا۔ کوئی ڈیڑھ دو سو آدمی ہوں گے جن میں سے زیادہ تو اریب نہ تھے۔ جہی تو لوگوں نے فقرے کہے کہ یہ لوگ ترقی پسند زیادہ ہیں اور مصنف کم۔ مگر میں اعتراض میں سچائی تھی اور جب کبھی ہم کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتے تو ہمارے سینے میں ایک تیر سا گنگنا تھا۔ لیکن سچائی کا ایک اور پہلو بھی تھا جسے یہ

لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اور جس سے ہم اب دس برس کے بڑے تلخ تجربوں سے گزرنے کے بعد کسی قدر واقف ہوئے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ ترقی پسند ہونا، اپنی سمجھ اور شعور کو ترقی پسند بنانا اور اپنے کردار میں ترقی پسندی پیدا کرنا، یعنی اپنی ذات کو بدلنا

در برابر بدلتے رہنا۔ تاکہ ہم ایک ترقی پسند انسان بن سکیں۔ یہ عمل زیادہ اہم زیادہ ضروری اور زیادہ مشکل ہے۔ اور بغیر ترقی پسند انسان بننے ہوئے کسی کا ترقی پسند مصنف ہونا بہت دشوار بلکہ میں کہوں گا کہ ناممکن ہے ہم اپنی نا سمجھی میں دستخو اور مجھوں اور بڑے آدمیوں کی حمایت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ حالانکہ ہمارا سب سے قیمتی

سرمایہ ہمارا وہ نصب العین تھا جسے ہم نے اپنے منشور میں متعین کیا تھا جسکی اہمیت اسوجہ سے نہیں تھی کہ اس پر بعض لوگوں نے دستخط کر دئے تھے بلکہ اس وجہ سے ہی کہ وہ ایک نئے شعور اور ایک زندہ صداقت کا حامل تھا۔ اس میں وہ نیا جذبہ اور نیا ارادہ جھلک رہا تھا جو صرف ہندوستان کے لوگوں کو ہی نہیں ساری دنیا کے محنت کش عوام اور دیانت دار اہل علم اور دانشوروں کو متحرک کر رہا تھا۔ ہم نے کہا کہ

”ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی

مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور

غلامی کے مسائل ہیں۔

ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاجاری راستی اور

توہم پرستی کی طرف لے جا رہے ہیں۔

ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو ابھارتی ہیں اور

رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں۔ تغیر اور

ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں،

(ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ)

ترقی پسندوں کی یہ خواہش اور ان کا یہ مقصد ہوائی نہ تھا۔ یہ ہماری معاشرت اور زندگی کے تقاضے تھے جو ترقی پسندوں کی زبان سے ادا ہو رہے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آزادی وطن اور اشتراکیت کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ایک سرے سے بیکر دوسرے سرے تک ترقی پسند ادب کی تحریک تیزی سے پھیل گئی۔ اور اپنی تنظیمی خالیوں کے باوجود ہندوستان کی بڑی بڑی زبانوں کے سب سے زیادہ ہونہار لکھنے والے اس تحریک کے احاطہ میں آ گئے۔ فرید براں ہمارے ملک کے اکثر مستند اور مشہور ادیب بھی اس تحریک سے وابستہ ہو گئے۔

حیدرآباد (دکن) میں گزشتہ سال (ستمبر ۱۹۴۵ء) اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی پہلی گل ہند کانفرنس ہوئی جسکی بنیاد پر کوشش چند نئے پودے لکھا ہے۔

میراجیال سے کہ یہ کانفرنس ہماری تحریک کے ایک نئے دور کا آغاز کرتی ہے اور تخلیق کے ابتدائی مراحل سے گزرنے کے لئے ہم نے نو سو سال لگائے ہماری تحریک نے جڑ پکڑ لی ہے۔ اب ہمارے سامنے سوال یہ ہے کہ یہ پودے بڑھیں بڑھکر مضبوط اور تناور پٹر بنیں، پھلیں اور پھوئیں۔ اگر ہم میں کوئی شخص ایسا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ اس نئے دور میں ہمارا کام پیسے کے مقابلے میں سہل ہے تو وہ سخت غلطی کر رہا ہے۔ اس لئے کہ وہ "بنیادی مسائل" جن کا ہم نے دس سال پہلے اپنے اعلان نامے میں ذکر کیا تھا۔ اگر انقلاب کی قوتوں کے زیادہ مضبوط ہونے کے باعث حل ہونے کے زیادہ قریب ہیں تو ساتھ ہی ساتھ انقلابی بحران میں گروتا

بخش توانا اور شاداب فضا میں سانس لے سکے۔

ہندوستان میں عوامی تحریکوں کی دھڑکنیں تیز تر ہونی لگیں کانگریس مسلم لیگ، اور کیونسٹ پارٹی ان تینوں عوامی جماعتوں نے جنگ کے دوران میں اپنے حلقہ اثر کو مضبوط کیا ہے اور اپنے حلقہ اقتدار کو پھیلا یا ہے۔ تینوں جماعتیں ملک کے ہر گوشے میں پھیلی ہوئی ہیں اور گوسای پلٹ فارم پر انکی یک جہتی کے آثار ابھی نمایاں نہیں ہیں تاہم مقام شکر ہے کہ ادبی محاذ پر تینوں جماعتیں ہمارے ترقی پسند گروہ میں شہر و شکر کی طرح گھسی ہوئی ہیں۔ ترقی پسند مصنفین میں بیشتر صحاب ایسے ہیں جو کانگریس، مسلم لیگ یا کیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور اگر نہیں رکھتے ہیں جب بھی وہ اپنے خیالات میں اور اعتقادات میں ان ہی میں سے کسی ایک نہ ایک عوامی جماعت سے ضرور متاثر ہیں لیکن ان مخالفت اور بظاہر متضاد رجحانات کے باوجود ان کے باغ اذمان میں اس استقبال کی ترتیب و توازن کا خاکہ ضرور موجود ہے جو ان تینوں جماعتوں کی یک جہتی کے سوا شرمندہ تکبیل نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے ادبی اور سیاسی مستقبل کے لئے یہ برادرانہ یک جہتی جو ترقی پسند مصنفین میں پائی جاتی ہے ایک نیک فال ہے۔ ہمیں ہرنج سے اور ہر صورت سے اس یک جہتی کی تائید کرنا چاہئے۔ عین ممکن ہے کہ وہ کام جو آج ہمارے ملک کے نوجوان ادیب کر رہے ہیں ہمارے بڑے بزرگوں کی سمجھ میں بھی آجائے یا خود ہمارا کام انہیں اس بات کے لئے مجبور کر دے کہ وہ پھر ایک ہو جائیں اور ملک کی آزادی اور حق خود ارادیت کے لئے کام کرنا شروع کر دیں تاکہ ہماری قومیں ایشیائی قوموں کی برادری میں اور پھر پوری دنیا کی قوموں کی برادری میں اپنی صحیح جگہ لے سکیں۔ اس وقت ملک کی فضا شاید اس کام کے لئے زیادہ سازگار نہیں ہے۔ شاید انتخابات کی سرگرمی میں اس وقت منافقت اور الگ الگ

مجھے بندہ پر زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ امر کم از کم میرے لئے تو اس قدر روشن اور روشن ہے کہ میں اسے دہرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کچھ بھی ہو عوامی جماعتوں میں لڑائی لگتی شدید کیوں نہ ہو جائے ہیں اپنا دماغی توازن نہ کھونا چاہئے۔ اور اس بات کو ضرور یاد رکھنا چاہئے کہ ایک دن فیصلہ ہو گا ایک دن اتحاد ہو گا ایک دن ہندوستان کی جمہوری اور عوامی تحریکوں کو اپنے مقصد اعلیٰ اپنے نصب العین کے حصول کی خاطر متحدہ محاذ بنانا پڑے گا۔ اس دن کو قریب لانے کے لئے اس نصب العین کی خاطر اس محاذ کی تخلیق کے لئے اور پھر اس اشتراک کی ترقی کے لئے جو آج ہمارے پلیٹ فارم پر ایک واضح، عملی صورت میں جلوہ گر ہے ہمیں اپنی ساری ادبی کاوشوں اور صلاحیتوں سے کام لینا چاہئے۔ اس لئے عوام کی بہتری پر عمومی جماعت کا فرض اولین ہے اور موجودہ دور میں اس ملک کے ادیبوں کے لئے بھی اس سے بہتر تخلیقی کارنامہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی کاوشوں سے اس دن کو قریب لے آئیں جب یہاں کے چالیس کروڑ انسانوں کے لئے ایک صورت حال کو وجود میں لانا اشد ضروری ہے۔

مگر ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ میں تو ادب کی وقتی اضافی اور ہنگامی قدروں سے بحث کر رہا ہوں۔ ادب کی تجھ دوامی ابدی قدریں بھی ہوتی ہیں ان کے متعلق ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اول تو یہ مجھے معلوم نہیں کہ ادب کی ابدی قدریں کیا ہیں۔ میں صرف ایک ابدی قدر سے واقف ہوں اور وہ ہے تغیر، ارتقاء، انسان کی سماجی زندگی میں تغیر مجھے اسکے ارتقاء کی ایک لازمی قدر معلوم ہوتی ہے۔ اور یہی ایک دوامی قدر ایسی ہے جس کا وجود میں تسلیم کر سکتا ہوں باقی جتنی بھی قدریں ہیں وہ انسان کے جو اس حزمہ اور اس کے احساسات کے دائرے میں رہ کر بدلتی رہتی ہے۔ اور اس لئے دوامی نہیں۔ اضافی، وقتی، اور ہنگامی ہیں۔ کچھ لوگ عشق کو ایک دوامی قدر سمجھتے ہیں لیکن میں اس سے متفق

نہیں ہوں۔ مرد اور عورت کی محبت میں بھی انقلابات آتے رہتے ہیں بارہویں صدی کا عشق بیسویں صدی کا عشق نہیں ہے۔ پتھر اور دھات کے زمانے سے لے کے موجودہ مشینی دور تک عورت اور مرد کے باہمی تعلقات پر نظر ڈالئے۔ آپ کو برابر تغیر ارتقار، تبدیلی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اب مختلف سماجی ماحول میں انسانی عشق کی مختلف قدریں پائیے گا۔ شادی سے پہلے، شادی کے بعد، شادی کے رسم و رواج میں گھر میں، گھر سے باہر، بچوں کی نگہداشت اور ان کے مالکانہ تصرف میں، جائیداد میں۔ رشتہ داری میں باہمی سوجھ بوجھ اور اشتراک عمل میں، زندگی کے ہر لحظہ میں اور ہر لمحہ میں، آپ عورت اور مرد کی باہمی محبت میں برابر تغیر دیکھیں گے اور اسکی مختلف صورتیں دیکھیں گے۔ انسانی تاریخ کا مسطالو کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ انسانی سماج میں عورتیں مردوں کی غلام ہوتی ہیں تو دوسرے سماج میں مرد عورتوں کے غلام۔ ایک سماج میں مرد اپنا حرم عورتوں سے بساتا ہے تو دوسرے سماج میں عورت اپنا گھر مردوں سے بساتی ہے۔ کسی سماج میں مرد جائیداد کا مالک ہے۔ اور عورت اس سے محروم ہے تو دوسرے سماج میں شخصی جائیداد کا مرکز و مرجع عورت کی ذات ہے۔ معاشی حالات سازگار ہوں تو عشق زندہ رہتا ہے، اور نہ ہو تو مر جاتا ہے۔ اور پھر خاص حالات میں ایک عشق کے بعد دوسرا عشق کرتا ہے اور عورت ایک مرد کی محبت میں خودکشی کی ناکام کوشش کے بعد زندہ رہتی ہے اور کسی دوسرے سے محبت کر کے پانچ بچے پیدا کرتی جیسا کہ میں نے ابھی کہا کہ محبت کی قدر بھی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ ان میں ہمیشہ تغیر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ زندگی میں ہر عورت یللی نہیں ہے اور ہر مرد مجنوں نہیں ہے۔ اس لئے ادب میں ہر داستان یللی مجنوں کی داستان نہیں ہو سکتی۔ بلکہ زندگی میں بھی اس قسم کی تمثیلیں بہت کم ہیں۔ ان کی حیثیت کلیہ کی نہیں ہے بلکہ مستثنیٰ کی ہے تو گویا یہاں بھی عشق کی ایسی قدر مستثنیات میں سے دکھائی دیتی ہے۔ اس لئے اسے ابدی قدر کا

مترادف جتنا حقیقت کو چھٹلانا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ صرف انقلاب کو اور تغیر کو اس دنیا میں روم حاصل ہے اور کسی چیز کو نہیں اور جس روز انسان نے اور اس کے سماج نے اور اس کے ادب نے اور اس کے تخیل نے اس تغیر، اس انقلاب کا ساتھ نہ دیا وہ بھی مٹ جائے گا ان جانوروں کی طرح جو آج سے ہزار ہا سال پہلے موجود تھے لیکن ارتقائی عملیہ پر کار بند نہ ہونے کی وجہ سے معدوم ہو گئے اس لئے ہم تو کسی ایسی موہوم، غیر واضح، غیر متعین ابدی قدر کے قابل نہیں ہیں۔ ادب میں ابدیت ایک بہکانے والا فلسفہ ہے اور اس میں بیکار کی موٹنگائیوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں اور مجھے تو اس امر کا اعتراف کر لینے میں کوئی حائل نہیں کہ ہم ابدیت اور ابدی قدروں کے پجاری نہیں ہم تو لمحے کے شاعر ہیں، ایک لمحے کے دستاں گو ایک لمحے جو اب ہے۔ ایک لمحے جو کبھی تھا ایک لمحے جو اب آئے گا تینوں لمحے جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے مماثلت بھی رکھتے ہیں جیسے بیج زمین میں اور جڑیں کھاد میں اور پھول پتیاں ہوا میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں۔ ہم اس زندگی کے پجاری ہیں جو حرکت ہے۔ جامد نہیں۔ جو زندہ ہے مردہ نہیں ہے جو تغیر پذیر ہے موت کی طرح ساکن نہیں ہے۔ کچھ اور کنول میں جو کچھ طے پیدا ہوتا ہے اور اس شہد میں جو کنول سے نکلتا ہے بہت فرق ہے اور یہ امتیاز تغیر سے پیدا ہوا ہے۔ اور یہ تغیر پہلے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے درجہ میں ملجاتا ہے اور بر منزل پر بلند ہوتا جاتا ہے۔ لوگ جسے حسن کہتے ہیں وہ تغیر ہی کی ایک صورت ہے اور اگر حسن کی تخلیق ہی ادب کا بہترین مصروف ہے تو اسکی تخلیق کم از کم ان ادیبوں سے نہیں ہو سکتی جو دفائی قدروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہیں اور اپنے ذہن کے غیر سماجی مرمیوں میں اپنے جامد تخیل کے بیمولے میں ایک فرضی اور موہوم غیر حقیقی فلسفے کی تشکیل و ترتیب سے

ایک زندہ متحرک توانا ادب کے بیٹا ٹور و کنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ ادب کا نا ط عوام سے توڑنے پر تلے ہوئے ہیں اور اسے ادب کے لفظی حصار میں قید کر دینا چاہتے ہیں۔ عوام سے موہ نہ موڑ کر اور عوام کے جذبات کو نہ سمجھتے ہوئے یہ بھی نہ جانتے ہوئے کہ عوام کیا سوچتے ہیں، کیا کھاتے ہیں کیا پہنتے ہیں کس طرح رہتے ہیں کس طرح محبت کرتے ہیں۔ ان سب زندہ حقیقتوں سے پرے جا کر جن میں زندگی کی خوشی اور زندگی کا کرب، اور اس کا بیکراں درد چھپا ہوا ہے ان سے بھاگ کر خانی خوبی اپنے ذہن کے تاریک گھر و ندے میں پھپھ کر سم کس طرح اس ادب کی تخلیق کر سکتے ہیں جو انسان کے لئے معراج مسرت ہے اور اسکی آرزوں اور تمنائوں کا منبع ہے؟ زندگی سے بھاگ کر نہیں بلکہ اس بے قرار ہر دم بدلتی ہوئی زندگی کے درمیان کھڑے ہو کر اسکی کشاکش اور کشاکش میں حصہ لے کر ہی ہم سچائی اور حسن اور خوب صورتی کی ترتیب و نوا نر سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ ایک سچے ادب، ایک حسین ادب، ایک خوبصورت اور توانا ادب کی تعمیر کسی اور ڈھنگ سے ممکن نہیں!

ایک اور بات ہے جس کے امکانات پر ہمیں غور کرنا ہے وہ ہے ذراتی فوٹ کا دور جو ہیر و شیما کی بیماری سے شروع ہونا ہے اور جسکی تکمیل کے امکانات اگلے پچیس برسوں میں پورے ہوتے دکھائی دیے ہیں۔ ذراتی انرجی کے ہم پہنچ جانے سے جہاں سائنس کے سامنے ایک نیا تجرباتی دور کھل گیا ہے وہاں اسکے تجرباتی پہلوؤں پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ابھی تو ذراتی انرجی کی تباہ کاریوں کی شروعات ہیں اور اگر ہمارے سائنس دان اگلی سست وال اور ماہرین جنگ ایسے تجرباتی عناصر پر اسی طرح زور دیتے رہے اور اگر جلد یا دیر اسکا کوئی توڑ یا تعمیری حل دریافت نہ کیا گیا تو اگلے بیس پچیس برسوں میں موجودہ انسانی نسل کی بقا کا مسئلہ بہت مشکل نظر آنے لگے گا۔ اس بات کی تو

مجھے امید ہے کہ سائنس کبھی نہ کبھی ذراتی انرجی کی تباہ کاری کا ٹوڑ ڈیر یا منت کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ لیکن جو چیز میرے پیش نظر اس وقت سے وہ ہے جنگ کے بڑھتے ہوئے مہلک اثرات۔ پچھلی تمام جنگوں سے گزشتہ جنگ عظیم زیادہ مہلک تھی اور موجودہ جنگ جو کہ ارض کے تمام خطوں پر پھیلی ہوئی تھی گزشتہ جنگ عظیم سے عظیم تر تھی۔ اور اگر سائنس کی ترقی کی وجہ سے موجودہ جنگی سلوجان میں اسی طرح اضافہ ہوتا رہا اور اسکی ہولناکی اسی طرح بڑھتی رہی تو بہت ممکن ہے کہ اگلی جنگ میں نہ آدمی زندہ رہے نہ اس کا ادب۔ سائنس دانوں کو کچھ کچھ احساس بھی ہو چلا ہے اور اب وہ انگلیہ ٹ میں اور امریکہ میں اپنی انجمن بنا کر خود ہی ذراتی انرجی کے تخریبی عناصر کی روک تھام کے لئے تجاویز پیش کر رہے ہیں۔ ترقی پسند ادیبوں کو بھی ان تمام تجاویز کی حمایت کرنا چاہئے؟۔ جو جنگ کے مہلک اثرات کی روک تھام کے لئے مختلف ملک کے لئے ترقی پسند عناصر کی طرف سے پیش کی جائیں۔ لیکن اس سوال کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک تو ہے ذراتی انرجی کے کنٹرول کو کسی بین الاقوامی انجمن کے سپرد کر دینا۔ لیکن یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا آسان اسے سمجھا جا رہا ہے کیونکہ مجھے تو یہ بھی شبہ ہے کہ امریکہ کی تجارتی اداروں کو شاید ذراتی انرجی کا استعمال اب تک معلوم ہو گیا ہو گا۔ اور اگر نہیں ہوا تو دو چار سال میں ضرور ہو جائے گا یہ کوئی ایسا بھید نہیں جو چھپایا جاسکے۔ اس لئے آئندہ جب بھی جنگ ہوئی اسے استعمال کیا جائے گا۔ اور پھر اسکے بوجھ مہلک اثرات ہوں گے وہ کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ اس لئے ذراتی انرجی کے بین الاقوامی کنٹرول سے کوئی خاص فائدہ نہ ہو گا۔ ہاں شروع شروع میں اسکی روک تھام کے لئے وقتی نتائج ضرور حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اصلی چیز تو جنگ ہی کی روک تھام ہے اور جنگ کی روک تھام اسوقت تک نہیں ہو سکتی اور

اس کا مکمل انداد اسوقت تک نہیں ہو سکتا جب تک دنیا میں فاسیت اور استعماریت اور دوسرے ایسے سماجی ادارے موجود ہیں۔ جو ایک انسان کو دوسرے انسان کی غلامی میں منسلک کرتے ہیں۔ جب تک دنیا میں منافقہ کا رواج ہے جب تک کہ ذرا بچ پیدا ہوا تب شخص ہی جاؤدا ہے۔ جب تک ادب نہ رہا یہ پرستی کا غر لخواں رہتا ہے جب تک پریس پر بینکروں کا قبضہ رہتا ہے اور جب تک مشینوں کو اور انسانی ہاتھوں کی پیداوار کو جمہوری اشتراک کے اصولوں پر تقسیم نہیں کیا جاتا۔ اس دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ سچی آزادی نہیں آسکتی۔ آزاد اور پائندہ ادب نہیں تعمیر ہو سکتا۔ اور مسرت اور ہمت اور توانائی اور ترقی اور حسن کی تجلیوں سے انسانی کائنات کا سینہ نہیں معمور ہو سکتا۔ اس لئے جنگ کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لئے ذرائع انرجی کی مولنا کیوں سے نجات پانے کے لئے ایک ہی راستہ ہے۔ زندہ متحرک، آگے بڑھتی ہوئی پھیلتی ہوئی رواں دواں اشتراکیت اس کے بغیر انسان کا مستقبل خطرے میں ہے۔ اور میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اب انسانی سماج اس درجے پر پہنچ گیا ہے اور جماعتی تضاد اس قدر تیز ہو گیا ہے کہ اب اس مسئلہ سے گریز ممکن نہیں۔ اب تو ہمیں یہاں آگے بڑھنا ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جانا ہے۔ جس طرح آج سے قرن ماقرن پہلے بہت سے جانور مٹ گئے اور اب انکی ڈبوں کے نشان آثار قدیمہ کی کھدائی میں دستیاب ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر انسانی شعور نے اسوقت فیصلہ نہ کیا اور تاریخ کے تقاضے کو اور اسکی انقلابی اہمیت کو نہ سمجھا تو یہ انسانیت اور اسکی تہذیب اپنے ہاتھوں خود کشتی کر لے گی۔ اور پھر آج سے سیکڑوں ہزاروں سال بعد جب کوئی دنیا جالو اس دنیا کو بوائے گا تو وہ اس دور کے آثار قدیمہ میں اس احمقانہ نظام زندگی کا سراخ ڈھونڈے گا جس نے اسے مرجانے پر مجبور کیا جس نے انسان کے

لئے ابدیت کو اور اسکی نسلی، تہذیبی، ادبی، سماجی، بقا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نامکمل حاصل
 بنادیا۔ اور وہ سوچے گا کہ اگر انسان ایسا فیصلہ نہ کرتا تو کیا ہوتا۔ یہ اگر انسانی
 تاریخ کا سب سے بڑا، اگر، باہوگا۔ لیکن میں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں
 میرا اعتقاد ہے کہ ہم لوگ صحیح فیصلہ کریں گے اور اپنی متحدہ کاوشوں سے اپنے ملک کے
 رہنماؤں کو اور دنیا کے رہنماؤں کو اس بات پر مجبور کریں گے کہ وہ صحیح راہ اختیار
 کریں اور جب منفعت کی خاطر یا جماعتی مفاد کے لئے یا عدم تدریجی بنا پر پوری
 انسانیت کو خودکشی کرنے پر مجبور نہ کریں اس لئے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ہر ترقی
 پسند ادیب کو اس وقت نہایت شدہ مد سے ہسترا کی نظام زندگی کی حمایت کرنا
 چاہئے۔ کہ انسانیت اب ایک نازک موڑ پر آگئی ہے جہاں اب اس سے گزرنے
 ممکن نہیں اور اگر ایسا نہ ہو تو یہ ایک ایسی جہازانہ غفلت ہوگی جسکی سزا ہم سب
 لوگ بھگتیں گے۔ وہ لوگ جو اس مسئلہ کو سمجھتے ہیں اور وہ لوگ جو اس مسئلہ کو
 نہیں سمجھتے ہیں۔

یہاں تک تو مقاصد کا تعلق تھا اب ایک آخری بات رہ گئی ہے اور وہ ہے
 ترقی پسند مقاصد و اغراض کی نشر و اشاعت چونکہ یہ اردو کے مندوبین کی کافر
 ہے اس لئے میں اپنی زبان کے مسائل پر اکتفا کروں گا۔ یہاں میں یہ بات نہایت
 صراحت سے کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا
 ہوں اور مجھے اسکی تاریخی ارتقا کا مطالعہ ابھی تک اس بات پر مجبور کر رہا ہے
 کہ میں اسے صرف مسلمان قوم کی زبان نہ سمجھوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس
 زبان کے غالب حصہ پر ہر مسلم قوم کی تہذیبی چھاب ہے اور ہندوؤں نے اسکی
 ترویج و اشاعت میں بھی مسلمانوں سے کم حصہ لیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت
 ہے جسے جھٹلانے سے خود فریبی کے سوا اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن اس
 پر یہی امر کے باوجود اس بات کو بھی کوئی جھٹلا نہیں سکتا کہ ہندوؤں نے اور

ملک کی دوسری قوموں نے بھی اردو کی اشاعت میں، اسے پھیلائے میں، برعکس اور اپنائے میں ایک معتد بہ حصہ لیا ہے اور دوسری قومی زبانوں کی ترقی کے باوجود اور فرقہ وارانہ رجحانات کی افزائش کے باوجود اور اس بد نصیب ملک کی کوتاہ سیاست کے باوجود مسلمانوں نے اور ہندوؤں نے اور سکھوں نے اور دوسری قوموں نے سب نے ملکر اسکی ترقی کے لئے اپنے بہترین انسان کا لبودیا ہے۔ منافقت کی دنیا میں بھی وہ ایک پودا ہے جس کی آبیاری ہم سب نے مل جل کر کی ہے اور اسے ایک پھول کی طرح ایک معصوم قسم کی طرح ایک منفرد کیفیت کی طرح حرز جاں بنا رکھا ہے۔ اس لئے ایک ایسی زبان کو جسے ہندوستان کی مختلف قوموں نے مل کے تخلیق کیا ہے کسی ایک قوم کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وقف کر دینا ایک ایسی زبردست تہذیبی اور تاریخی غلطی ہوگی جس کی مثال دنیا میں مشکل سے ملے گی۔ اگر امریکہ اور انگلینڈ دو مختلف قومیں ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور ہوتے ہوئے بھی ایک زبان کو رکھ سکتے ہیں اور اسے اپنی تہذیبی روح کا مرکز بنا سکتے ہیں تو ہندوستان، اور پاکستان ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی کیوں اس زبان کو اپنا نہیں سکتے۔ جسے انہوں نے خود تعمیر کیا ہے۔ پھیلا یا ہے۔ آگے بڑھایا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو حق خودارادیت دینے کے باوجود اور دوسری صوبائی زبانوں کو پر دان چڑھانے کے باوجود ایک ایسی زبان کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ جو اس ملک کی تمام قوموں کی زبان بن سکے۔ پیرے خیال میں اردو اس ضرورت کو کہ حصہ طور پر پورا کرتی ہے اور میں تمام پریشانیوں اور دقتوں اور مضامحتوں اور سیاسی مناقشات کے باوجود اسکی ترویج و اشاعت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی چاہئے۔ اسکے دائرہ اقتدار کو ایک ہی قوم برصغیر و نہ کر کے یہ کوشش کرنی چاہئے کہ یہ ہندوستان کی

تمام قوموں کی باہمی زبان بن جائے۔ اسکے لئے اگر ہمیں دوسری قوموں کے تہذیبی عناصر کو جگدینا پڑے تو دینا چاہئے۔ ہمیں ہر بیج سے ہر ڈھنگ سے ہر ممکن کوشش سے اسے ہندوستان کی، اسکی ساری قوموں کی ان کے کلچر کی اور ان کے تہذیبی کارناموں کی زبان بنانا چاہئے۔ میں اس میں اردو کی ترقی دیکھتا ہوں اور اسی میں ہندوستانی کلچر کے HIGHER SYNTAXES کی بنیاد دیکھتا ہوں۔ جو آگے چل کر پورے ایشیا کی تہذیبی ترقی میں برابر کی حصہ دار ہو سکتی ہے۔

ترقی پسند اغراض و مقاصد کی اشاعت کے لئے جہاں ہمیں اپنی زبان کے دائرہ عمل کو وسعت دینا ہے۔ وہاں ہمیں اپنے ادب کے ان پہلوؤں پر بھی غور کرنا ہے جن پر ابھی کوئی کام نہیں ہوا جو ابھی ہماری کوتاہیوں کے پیش نظر تشذیب تکمیل ہیں۔ جدید تاریخی، سائنس، فلسفہ، معاشیات، سیاست ان تمام امور پر اعلیٰ کتابوں کی شدید ضرورت ہے۔ ترقی پسندی اس بنیادی مشق کی طرف ابھی تک ہم نے کوئی کام نہیں کیا۔ مزدوروں اور کسانوں تک پہنچنے کے لئے ابھی بہت سے کام کی ضرورت ہے۔ سستی کتابوں کی ضرورت ہے اور آسان سلیس زبان میں لکھنے کی ضرورت ہے اور اس نقطہ نگاہ کی ضرورت ہے جو مزدوروں اور کسانوں کی ضرورت کو پورا کر سکے اور انہیں زندگی کے مسائل سے آگاہ کرے وہاں ان کے لئے ایک صحیح مندرجہ نشا کا سامان بھی بنایا کر سکے ہمارا ادب اور ہماری ادبی کاوشیں اس لحاظ سے بڑی حد تک بار آور اور مشکور نہیں ہیں۔ ہمارے ترقی پسند ادب کے مواد کا بیشتر حصہ اور اس کا خمیر متوسط طبقے سے اٹھایا گیا ہے اور یہی طبقہ ہماری توجہ کا مرکز ہے۔ ایک حد تک موجودہ صورت حال میں یہ ناگزیر بھی ہے لیکن اب ہمیں اس حصار کو توڑنے کی کوشش بھی کرنا چاہئے۔ اپنی آواز کو مزدوروں اور کسانوں اور کسانوں کا

ترجمان بنانا چاہئے۔ اس حد تک نہ صرف متوسط طبقہ ہماری آواز سے بلکہ کسان اور مزدور بھی اس سے مستفید ہوں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اگر ہمیں عام عہد بننا پڑے۔ صحافت کا سہارا لینا پڑے۔ اپنے ادبی معیار کو کم کرنا پڑے تو بھی میں اسے اپنے اغراض و مقاصد کے پیش نظر اسے جائز سمجھوں گا۔ اس لئے ادب کا منبع اور سرچشمہ عوام ہیں۔ اسی سرچشمہ سے ہم لوگ سیراب ہوتے ہیں۔ یہی سرچشمہ ہمیں قوت بخشتا ہے اور جیانت عطا کرتا ہے اور اگر ہم نے بدستور اس سرچشمہ سے اپنا منہ موڑے رکھا اور اسے قابل اعتناء نہ رکھا تو ہمارا ادب سوکھ جلے گا۔ اور اسکی جیتی جاگتی بہاروں میں خزاں آجائے گی۔ اور وہ مقصد جسے ہم لے کر اُٹھے ہیں کبھی پورا نہ ہوگا۔

کوشن چندر

_____ بوری بندر

جب کرسٹن چندر بوری بندر کے سٹیشن پر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ سید سجاد ظہیر جو کمیونسٹ ہونے کے باوجود اپنے اپنے نام کے پیچھے سید لکھتے ہیں، کچھ اداس، کچھ پریشان سے کھڑے گیارہ نمبر کے پلیٹ فارم کے باہر اُس کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ پستہ قد مصنف نے جس کے فرائخ ماتھے سے بال بڑھی تیزی سے غائب ہو رہے تھے اور جس نے اپنی بے چین آنکھوں کو عینک کے دمنر شیشوں سے ڈھانپ رکھا تھا سید سجاد ظہیر کے

قریب جا کر ملتجیانہ انداز میں معذرت پیش کرنے کی جرأت کی۔
 بھئی — سید سجاد ظہیر نے شروع کیا۔ لیکن کرشن چندر

اسی لمحے بول اٹھا۔ بھئی معاف کرنا، دیر ہو گئی۔ اُس نے اپنے
 لبوں پر ایک جھوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ یہ تو کچھو۔ ملاؤ
 سے آ رہا ہوں۔ یہاں سے اٹھارہ میل کا فاصلہ ہے۔ پیر پوری
 بچوں سے بھی رخصت ہونا تھا۔ اور کسخت یہ سااں ساتھ تھا
 اور نوکر عین وقت پر کہیں بھاگ گیا۔ اور.....

بس کرشن چندر اسی طرح بے ربط تجھے کہتا جا رہا
 تھا۔ بظاہر بے ربط لیکن باطن بدرجہ غایت مرتب تھے۔ یہ
 بے ربطی اُس کے افسانوں میں ہے۔ اُس کی زندگی میں بھی
 نظر آتی ہے۔ لوگ بہر صورت دھوکا کھاتے ہیں۔ بے چارے
 وہ مسکرا رہا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے لبوں تک بھی اک
 مسکراہٹ آتی۔

کس قدر لطیف پاکیزہ، نورانی مسکراہٹ بھئی سید
 سجاد ظہیر اطوار و گفتار میں بالکل چمکے کے سوداگر معلوم ہوتے

میں اُن کی مین اور خاموش صورت دیکھ کر کوئی اُن کی جو دتِ طبع کا اندازہ نہیں کر سکتا لیکن جب وہ مسکراتے ہیں۔ تو ذہانت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ تبسم ہے کہ ہنستا ہوا کنول ہے، شوخ ہے، خوبصورت ہے، دلکش ہے، نور کا فوارہ ہے۔

تخیل کا کوندا ہے، ذہانت کی لہر ہے، اُڑتی ہوئی۔ بن کھاتی ہوئی آگے بڑھتی ہوئی۔ ریحانی، سیلابی، طوفانی، چشمِ زون میں ایک سیدھے سادے، موٹے موٹے، روکھے روکھے، چہرے کو سرسبز شاداب بنا دیتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید سجا و ظہیر کے پاس اس تبسم کے سوا اور کچھ ہنسی نہیں۔ (شاید اب وہ ہر روز آئینہ میں دیکھ کر مسکرایا کریں گے) ایں واللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ تبسم

سچ..... بخدا)

سید سجا و ظہیر نے مسکرا کر صاف کر دیا۔ چلو بھئی۔ بس اب..... یہ لو اپنا ٹکٹ۔ گاڑی چھوٹنے میں چند منٹ باقی ہیں۔ اتنا کہہ کر انہوں نے گھبرا کر پلیٹ فارم کی کھڑی کی طرف دیکھا۔
دفعاً علی سردار جعفری سر پر آن کھڑے ہوئے اُن کی

بے کر بڑپتلون، بڑھے ہوئے بال اور گھونٹہ مار کہ چہرہ بڑے
 بڑے جفا داری ادیبوں پر غشہ طاری کر دیتا ہے۔ کرشن چندر
 نے انھیں آتے دیکھ کر اپنی پلکیں جھپکائیں اور اوہراؤ دھر دیکھنا
 شروع کر دیا۔ لیکن ان حرکتوں سے کیا ہوتا تھا۔ سردار نے
 بڑے زور سے اُس کے کندھے پر ہات رکھ کر کہا۔ "کیوں بھائی،
 یہ کیا حرکت ہے، اس وقت چلے آ رہے، گیارہ بجے کا وقت
 نہیں دیا تھا؟ اب دیکھو ایک بیچ رہا ہے، خیر اب جلدی سے
 سامان..... یکا یک سید سجاد ظہیر نے چونک کر کہا۔ "ہاں
 بھئی چلو، خدا جانے اب تک وہ وہاں کھڑے کیا سوچ رہے
 تھے۔"

گاڑی میں

تھرڈ کے ڈبے پر "سکندر آباد" لکھا تھا۔ سکندر آباد جو
 حیدرآباد دکن میں واقع ہے۔ تھرڈ کا ڈبہ جو نظام اسٹیٹ
 ریلوے کی ملکیت تھا اس وقت بوری بندر کے سٹیشن پر کھڑا
 تھا۔ اور مسافر اس میں گرگڑ کی بھیلیوں کی طرح لدے ہوئے
 تھے۔ نظام اسٹیٹ ریلوے کے تیسرے درجے کے ڈبوں
 میں بھی بجلی کے پکھے لگے ہوتے ہیں، چنانچہ جہاں ترقی پسند
 ادیبوں کا گروہ بیٹھا تھا وہاں اتنی گھٹن نہ تھی۔ وراصل ان

لوگوں نے اپنے بیٹھنے کے لئے اچھی جگہ حاصل کر لی تھی، پورے ڈبے میں صرف دو پنکھے تھے اور جہاں یہ پنکھے تھے وہیں ترقی پسند ادیب بھی تھے، دونوں پنکھوں کے نیچے آٹھ سائے ٹولیاں بنا کے بیٹھ گئے تھے۔ گاڑی میں اس لئے بیٹھے تھے کیونکہ حیدرآباد دکن جا رہے تھے، اور حیدرآباد دکن اس لئے جا رہے تھے کہ وہاں اردو کے ترقی پسند ادیبوں کی کل ہند کانفرنس تھی۔

ایک ٹولی میں سید سجاد ظہیر، ڈاکٹر طاہرہ راج آسنند، مدن گوپال، سبیط حسن، اوپندر ناتھ شامل تھے، دوسری ٹولی میں علی سردار جعفری، رفعت سروش، قدوس نہبانی، عادل رشید، کرشن چندر اور کیفی اعظمی تھے، کیفی اعظمی نے اپنی بہیت ایک چرس پیئے والے فقیر کی سی بنا رکھی تھی، وہ ایک بوسیدہ کمبل اوڑھے ہوئے، کھڑکی سے پیٹیٹ لگائے، آنکھیں بند کئے اونگھ رہے تھے اور دوران سفر میں کبھی کبھی آنکھیں کھول کر کمال حیرت و استعجاب سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ لیتے ان کی نگاہ گویا کہہ رہی تھی۔ ہائیں۔ تم لوگ ابھی تک اس ڈبے

میں ہو۔ کچھ کھا کے سو کیوں نہیں گئے۔ اُن کی شکایت آمیز نگاہوں کو فوج
 اداہوں کے لئے اک مسلسل مرثیہ تھا۔ عادل رشید اپنی سیٹ پر
 اس طرح بیٹھے تھے گویا فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے ہوں،
 سیدطحسن، اور مہندر ناتھ نے دُنیا کی بے ثباتی اور موجودہ
 دور کی رجعت پسندی پر اچھی طرح غور کرنے کے بعد شطرنج
 بچھالی کھنی اور مہروں کو پٹینے میں مصروف ہو گئے کیونکہ امیر
 لوگوں کو پٹینے سے تو یہ لوگ رہے، رخصت سریش کا سنولا چہرہ
 اپنی معصومیت اور خطرناک سادگی کی مکمل رعنائیاں لئے ہوئے
 ایک سر مٹی کبوتر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ جو اپنی چھتری پر بیٹھا
 ہوا بڑی بے صبری سے اس کے کان میں چپکے سے کہدے ”غٹر غوں۔
 — بول کبوتر بول !“

گاڑی کے چھوٹنے میں ابھی دو منٹ باقی تھے، کراشن جنڈ
 نے جو حال ہی میں کسی فلم کمپنی میں ملازم ہوا تھا اپنی نئی امارت
 جتانے کے لئے چار روپے کے سنگترے پھل والے سے خرید کئے

اور انھیں اپنے ساتھیوں میں بانٹنے لگا۔ ازل کا بھوکا اور کمینہ
 ساتھ ساتھ کہتا جا رہا تھا۔ لو بھئی کھاؤ نا۔ ارے پار۔ بہت میٹھے
 ہیں یہ سنگترے۔ اور چہرے پر وہی جھوٹی مسکراہٹ تھی۔ خوب میں
 یہ سنگترے۔ رنگترے۔ رس بھرے۔ ارے بھائی۔ اس میں ڈامن
 بھی ہے، اماں یا ایک تو چکھو۔“ پلکیں جھپکا جھپکا کر وہ سنگترے
 تقسیم کر رہا تھا۔ راک فیئر کا سالا!

ادیبوں کے کاہن ملک راج آند اور سید سجاد ظہیر آمنے
 سامنے بیٹھے تھے، دونوں براق کھدر میں ملبوس تھے۔
 سجاد ظہیر کے کھدر کا رنگ سپید تھا۔ تو ملک راج آند کا
 رنگ جو گیا تھا۔ لیکن لباس دونوں کا وہی تھا۔ وہی ٹوپی،
 وہی جواہر جکیٹ، وہی پانسجامہ، ملک راج آند کے منہ
 میں پائپ تھا۔ تو سید سجاد ظہیر کے لبوں پر تبسم، ملک راج آند
 کے گداز اور سرخ کلتے اور اس کے بھرے بھرے فریہ
 ہونٹ انگلستان کی آسودگی کے مظہر تھے۔ ان کے پائپ
 کا دھواں اڑ کر چھت کی طرف جاتا تھا۔ اور پھر یکا یک

پٹکھے کی ہوا سے فضا میں منتشر ہو جاتا تھا۔ آئند اور سجاد ظہیر دونوں ادبی کانفرنس کے پروگرام طے کر رہے تھے اور دن گوپال جنھوں نے منشی پریم چند کے آرٹ پر ایک کتاب انگریزی میں لکھی ہے اُن کے قریب بیٹھے ہوئے ان دونوں ادیبوں کی گفتگو اس اہٹاک سے سُن رہے تھے۔ گویا کسی اہامی تفسیر سے روشناس ہو رہے ہوں۔ دن گوپال کا غصہ یہ ہے کہ وہ محض اپنی خاموشی ہی سے لوگوں کو پریشانی میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ مہذر ناٹھ اور سبط حسن کبھی کبھی بساط سے گردن اٹھا کر نگاہ پھیر کر ڈبے میں چاروں طرف دیکھ لیتے اور کہیں آسودگی نہ پا کر پھر مہروں کو پیٹنے میں مصروف ہو جاتے۔ قدوس صہبائی مدیر نظام تکیہ کا سہارا لئے منہ میں یوکلپٹس کی گولی ڈالے دونوں ٹانگیں سکیڑے اس طرح بیٹھے تھے گویا پرانی بوا سیر کے شکار ہیں۔ کرشن چندر نے ازراہ ہمدردی اُن سے کہا " لیجئے۔ آپ بھی کھائیے نا! "

" شکریہ " وہ بولے " مجھے تو نزلہ ہے " اس کے بعد

انہوں نے خود سگریٹ پیش کیا۔ ”لیجئے۔“

”شکریہ۔“ کرشن چندر نے انکار کرتے ہوئے کہا ”مجھے تو پھینچنا ہے۔ اور پھینچنا میں تمباکو کو — آپ خود جانتے ہیں؟ میں خوب جانتا ہوں۔ قدوس صہبائی نے شہیدوں کا سائیکس اپنے چہرے پر لاکر کہا ”مجھے دس سال سے پھینچنا ہے۔“

”مجھے پندرہ سال سے ہے“ کرشن چندر نے عاجزی سے

کہا۔

”اور میرے بزرخڑے کے اعصاب میں ورم بھی ہے“

قدوس صہبائی نے نہایت انکسار سے جواب دیا۔

”میری آنٹوں میں موزش ہے۔ اور ول میں اختلاج ہے

اور جگر میں پتھری ہے۔“ کرشن چندر نے نہایت مسکین، میٹھے لہجے

میں کہا۔ ”ڈاکٹر کہتے ہیں۔ میں صرف تین سال تک زندہ رہوں گا

خدا کرے میرا وہ ناول مکمل ہو جائے۔“

”کون سا ناول؟“ قدوس صہبائی نے پوچھا ”کوئی

نیانا دل آپ لکھ رہے ہیں، بھئی ڈراجی لگا کے لکھئے گا۔ وہ آپ کا

ناول۔ ”شکست“۔ تو بالکل۔۔۔ معاف کیجئے گا۔۔۔ بھئی

فلاپ ہے۔ بالکل.....“

کرشن چندر سنگترے کی پھانک کھاتے کھاتے اُس کے
 کڑوے بیج بھی نکل گیا۔ کہنے لگا۔ ”ذرا یہ۔۔۔ اس پنکھے کا
 رخ اس طرف موڑ دیجئے۔ ان کس قدر گرمی ہے۔ دم گھٹا جا رہا
 ہے۔“

قدوس صہبائی نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ پولیس کی گولی لیئے

مفرح ہے۔“

”وہ مارا۔۔۔ وہ مارا۔۔۔ دوستو۔۔۔ وہ مارا“

یکایک ہنڈرناٹھ دھاڑا۔

”کیا بات ہے۔ کیا بات ہے“ یکایک کینی اعظمی نے

گھبرا کر اور آنکھیں کھول کر پوچھا۔

”دوستو۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ بس اسی سبب حسن سے پوچھو

مات دیدی اسے کہ نہیں؟ وزیر اور فیمل اور سب پیادے

دھرے کے دھرے رہ گئے۔ دوستو!“

سب نے اپنے گھنگھریالے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے
 اک نستعلیق انداز میں کہا۔ ”ااں۔ پٹاؤ بھی۔ کیوں شور مچاتے
 ہو بے کار۔ آخر پنجابی ہونا۔ تو آؤ۔ اب کے تمہیں مات نہ
 دیدیں تو۔“

گاڑی رٹنے یا خدا جانے کس نے سیٹی بجاتی اور گاڑی
 چلنے لگی۔ ادیب گاڑی سے باہر جھانکنے لگے۔ لیکن ان بچاروں
 کو الوداع کہنے والا وہاں کون تھا۔ ایک خوبصورت ایرانی
 عورت اپنے خاوند کو الوداع کہہ رہی تھی۔ ایک پارسی لڑکی
 قوس قزحی ساڑھی پہنے دوسرے درجے میں کھڑی رومال
 بلا رہی تھی۔ اور اُس کا محبوب پیار بھری نگاہوں سے اُسے
 نگہا گیا۔ اور گاڑی آہستہ آہستہ چلتی گئی۔ ایک مرہٹے نے
 اپنے بیٹے سے کہا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شولا پور
 پر بھائی صاحب تجھے گاڑی سے اتاریں گے۔ گھبرائیو نہیں۔“
 لیکن ان ادیبوں کے لئے وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ باپ۔ نہ محبوب
 نہ ماح۔ بے چارے خود ہی ہات ہلا ہلا کے رہ گئے۔ اور

جب گاڑی پلیٹ فارم سے باہر نکل گئی۔ تو پھر اپنی سیٹوں پر
آن بیٹھے اور بے بسی کے عالم میں اونگھنے لگے۔

کرشن چندر جب اُداس ہوتا ہے تو سیگٹ پتا ہے
لیکن خود خرید کے کبھی نہیں پتا ہے۔ ہمیشہ دوسروں سے
مانگ کر پتا ہے، اُس کی اس عادت سے اُس کے دوست اچھی
طرح واقف ہیں۔ اور اُسے اکثر پریشان بھی کیا کرتے ہیں۔ اس
وقت بھی کرشن چندر کو سیگٹ کی طلب محسوس ہوئی لیکن
اُسے کسی نے سیگٹ نہیں دیا۔ نہ جانے ان لوگوں کے
پاس سیگٹ نہیں تھا۔ یا ان لوگوں نے اُسے پریشان کرنا
ہی مناسب سمجھا۔ بہر حال اُسے اپنے ساتھیوں سے سیگٹ
نہیں ملا۔ اور وہ مایوس ہو کر اور گردن جھکا کر اپنی جگہ پر
بیٹھ گیا۔ اور اس کے دل کی دیرانی اور بڑھ گئی۔ یکایک اُس کے
قریب بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے کہنی مار کر اُسے اپنی طرف
متوجہ کیا کرشن چندر نے دیکھا ایک کالا بھجنگ بد صورت
نوجوان ہے۔ جس کے وانت بے حد سپید ہیں۔ اور اپنی

جلاسے موتیوں کو بھی شرماتے ہیں اور وہ اُسے سیگٹ پیش کر رہا ہے۔ کرشن چندر نے شکر یہ کے ساتھ اُس سیگٹ کو قبول کیا۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ وہ نوجوان نظام سٹیٹ ریلوے میں مزدور ہے۔ اور حیدر آباد وکن جا رہا ہے کرشن چندر کو یاد آیا۔ کہ سنگترے تقسیم کرتے وقت اُس نے اپنے ہمسائے کو سنگترہ نہیں پیش کیا تھا۔ کیونکہ اُس کے کپڑے نئے رنگ کے تھے اور میلے کھیدے تھے۔ اور اُس کا رنگ کالا تھا اور وہ بد صورت بے ڈول اور کہ یہ منظر تھا۔ اور مزدور تھا۔ کرشن چندر نے سیگٹ پیتے پیتے سوچا کہ وہ ابھی تک بورژوائی اخلاق کے تضاد میں گرفتار ہے سردار نے اُس کی ذہنی کشمکش کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا ”دیکھا تم نے ایک پروٹناری کا اخلاق؟“ اور پھر فوراً چُپ ہو گیا۔ رفعت سردش نے عادل رشید سے کہا۔ ”بھی ہمیں تو بھوک لگی ہے“ سیٹ کے نیچے ایک ٹوکری میں کچھ سامان خور و نوش بھی تھا۔ عادل رشید نے وہ ٹوکری اٹھا کر

اپنی راون پر رکھ لی۔ اور اب وہ دونوں انڈے اور روٹی۔
 مکھن نکال نکال کر کھانے لگے۔ مکھن ٹین کے ڈبے میں بند تھا۔
 اور چاقو کسی کے پاس نہ تھا۔ اس وقت وہی مزدور اپنے کام
 آیا۔ اور سب لوگ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ اس مرتبہ بھی
 کرشن چندر اپنے ہمسائے کو کھانے کے لئے پوچھنا بھول گیا۔
 سب لوگ جلدی جلدی انڈے توں مکھن اور پھیل ڈکار گئے۔
 بہت عرصہ کے بعد یکایک کرشن چندر کو خیال آیا۔ اور اُس نے
 چونک کر کہا۔ ” ارے بھئی۔ کچھ اسے بھی دیدیا ہوتا۔ اپنے
 ساتھی کو۔“

مزدور مسکرایا۔ وہ اُن کا ساتھی تھا۔ لیکن انڈے توں
 مکھن پھیل کھانے والا ساتھی نہیں۔ وہ تو فرسٹ خاک پر بیٹھ کر
 تقریریں سننے والا ساتھی تھا۔ اُس نے آہستہ سے اپنے
 چاقو سے مکھن کو الگ کیا۔ اور اُسے بند کر کے اپنی جیب میں
 ڈال کر چار مینار کا سیگریٹ پیئے لگا۔

ترقی پسند ادیبوں کے علاوہ اس ڈبے میں کوئی سوڈیٹر
 سو آدمی اور ہوں گے، دو مولوی تھے۔ چار سو دو خوار پٹھان
 تھے، آٹھ دس ہنٹے تھے جو دوسرے درجے میں سفر کر سکتے تھے
 لیکن روپیہ بچانے کی خاطر تقر ڈہیں آنتی پالتی مارے بیٹھے تھے
 کوئی پنڈرہ میں ریلوے کے مزدور تھے، ایک چنا جو گرم
 بیچنے والا تھا۔ ایک ویسی عیسائی اپنی بیوی کے ساتھ سفر کر رہا
 تھا۔ بیوی نے اپنے تین بچے سیٹوں پر سلا رکھے تھے۔ اور
 خود بھی نیلا سایہ بن کر کھڑا مارے بیٹھی تھی۔ اس کی سیاہ
 اور مضبوط ٹانگیں گھٹنوں تک ننگی نظر آتی تھیں اور بالوں سے
 پر تھیں۔ ٹخنوں پر اونچی ایڑی کے سپید سینڈل کا شمشہ بندھا
 تھا۔ اس ڈبے کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے پر
 مفلوک الحال کسان بوسیدہ چیتھرون میں لپٹے ہوئے کھڑے
 تھے اور بلند آواز میں باتیں کرتے جاتے تھے۔ کتنی عجیب باتیں
 کہتے وہ۔ زمین کی باتیں۔ پٹواری کی باتیں جریب اور کھوتنی
 کی باتیں۔ ہل کی باتیں۔ بیل کی باتیں۔ فحط کی باتیں۔ بیاہ کے لئے

بنیے سے سود پر رتم حاصل کرنے کی باتیں گھر کو گردی اور نہ سین
 کو رہن کرنے کی باتیں۔ عجیب و غریب باتیں۔ نہ عشق و محبت کی
 باتیں۔ نہ صن جہاں سوز کی باتیں، ساتی کی باتیں نہ شراب
 ناب کی باتیں، مذہب کی باتیں نہ جنت کی باتیں اکا بے پناہ
 شور تھا۔ اک مسلسل ہنگامہ۔ ایک مستقل دوزخ، اک آگ
 اک بو، اک سٹرانڈ، جیسے وہ پھر ڈکا پورا ڈوبہ انسانیت کا
 سنڈاس تھا۔ اور جس میں ترقی پسند ادیب اس طرح دھڑے
 تھے جس طرح کوئی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر سیب کی سرنج
 و سپید تاش پھینک دے۔

ڈاکٹر ملک راج آنند نے کہا: "پھر بیٹی و دامی قدیں
 بھی ہوتی ہیں۔"

"بے شک بے شک۔" مدن گوبال نے پشدر کہا، طرح
 رٹتے ہوئے کہا۔

"کون سی دامی قدیں ہوتی ہیں بغا ب؟" علی سردار نے
 گویا گھونسا دکھاتے ہوئے کہا۔ سردار کے چہرے پر سیاسی تجربوں

کی صورتوں کے تمام نشانات موجود ہیں۔ اس کی پیشانی پر مستقبل کے نئے عزائم کی بڑ ہے۔ وہ جب بات کرتا ہے۔ دانت پیس کر، تہر میں ڈوب کر، اک جلالی مجذوب انداز میں۔ جو بات چہرے میں ہے۔ وہی چال ڈھال میں، وہی گفتار میں، ایک تنا ہوا ٹھوس ٹھوس اک جاہد ہتھیوڑا اور ہنسیا سرنج جھنڈا گویا اس کے چہرے پر گر ا ہوا ہے۔ سردار کی ذاتی شخصیت اب گھٹتے گھٹتے صفر ہو کے رہ گئی ہے۔ اس سے بات کیجئے۔ معلوم ہوتا ہے آپ ایک کتاب پڑھ رہے ہیں۔ ایک تحریک کا سامنا کر رہے ہیں، کے کی اک شوق کا مطالعہ کر رہے ہیں اس نئے انداز فکر سے دوچار ہو رہے ہیں۔ مجھ میں نہیں آتا کیسے۔ بعد ان کے دل کو شاعر بنا دیا ہے۔ پھول سے کھل گئے۔

تصور تیں۔ دامن شوق بھر گیا کوئی.....

ملک راج آنند نے پائپ کی راگھ جھاڑ کر اک مخصوص طرز انداز میں کہا یہی خوبصورتی بہترین جمال مجھے یہ جاکر انہوں نے کہا جہاں

ہندوستانی ادیبوں نے سماجی مواد کی فراہمی میں اتنی مستعدی سے کام لیا ہے۔ وہاں وہ اُسے پیش کرنے میں کمال فن کا ثبوت نہیں دے سکتے..... میری مراد ہیئت سے ہے۔ سماجی مواد خوبصورتی سے پیش کرنا ہی صحیح حسن کاری ہے۔ جنگ کے دوران میں ہندوستان کے ترقی پسند ادیبوں نے کونسا ایسا قابل فخر کارنامہ.....

کرشن چندر نے مجھلا کر کہا۔ اور آپ کے انگریزی دیوں نے کونسا ایسا کمال کر کے دکھایا ہے۔ آپ کے آڈن نے..... آڈن بہت بڑا شاعر ہے جناب آئندے جواب دیا۔ اس کی ساعری میں شیکسپیر کے کلام کی سی عظمت ہے۔ کرشن چندر نے سنی ان سنی کر کے کہا۔ آپ کے آڈن نے اسٹڈ نے، لیک منس نے ہسکلے نے، بریٹے نے، کوئی یوگا میں اُلجھ کے رہ گیا۔ تو کوئی سنٹ فلموں کے مکالمے لکھنے لگا۔ بریٹے سیدھا سادا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ انگریزی استعماریت کے حق میں، بورے نکلس ہندوستانیوں کو صلواتیں سُناتے

سناتے ہیں۔ کچھ لوگ اے۔ آر۔ پی۔ پرکتا میں لکھ رہے ہیں
 واہ رے حسن کاری.....

یہ میں مانتا ہوں کہ ابھی تک بیشتر امریکی اور انگریزی
 مصنف اس نیم جمہوری استھارٹ کے دلدادہ نظر آتے ہیں۔
 اس لئے اُن کا خیال ہے۔ کہ اُن کی تہذیب اور اُن کا سماج
 اور ان کا اقتصادی نظام ابھی بیس پچیس برس اور چلے گا۔ اسلئے
 وہ کیوں خواہ مخواہ اس سے لڑائی مول لیں۔ اور اپنی روزی
 خطرے میں ڈالیں۔ وہ اتنے بیوقوف نہیں ہیں۔ اب یورپی
 معتقوں کو لیجئے۔ جدید یورپی شاعری کو جو فروغ حاصل
 ہو رہا ہے۔

”کہاں ہو رہا ہے؟“ سردار نے جہل کر کہا۔ ”ایک آراگان
 کو چھوڑ دیجئے۔ اور وہ ایک اور کو۔ باقی شاعروں نے کیا
 اپنے آپ کو اور اپنے فن کو نازلوں کے حوالے نہیں
 کر دیا تھا۔ خاص طور پر فرانسیسی زوال پسندوں نے۔ کہیے
 تو ایک نہیں درجنوں مثالیں پیش کر دوں۔ ابن الوقتی پر آدرش

کو قربان کر دینے سے کبھی آرٹ یا آرٹسٹ غظیم نہیں ہو سکتا۔

APOCALYPTIES آئند نے شروع کیا لیکن اب اس پر

چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے، "کیفنی نے جھنجھلا کے کہا"

اس گروپ کا کیا کہتے ہو۔ ایک ہی مجموعہ چھاپ کے رہ گئے

لغویات کا پلندہ چلے تھے۔ ہمیش دیو مالا کے بل پر قوم کی

حالت سدھارنے، ہمیش دیو مالا۔ جس میں انسانی بھڑیلوں

کے قصے ہیں۔ اور جہاں دوست کی بیوی کو بہکانا بھی دیتوئی

میں شامل ہے۔ کیا یہی ادب کی دوامی قدریں ہیں۔ کیا

انھیں قدروں کی بنا پر ایک نئے 'بہتر' اور بھرپور سامع کی

داغ بیل ڈالی جائے گی؟

اُسے کن لوگوں کا ذکر کر رہے ہو۔ سردار نے کہا: "وہ بیچاریے

تو کب کے ختم ہو گئے۔ اب تو شاعری چھوڑ چھاپ کے اپنے پیٹ

کا دھندا کر رہے ہیں۔

"بے شک بے شک" دن گوپال نے دریں چہ شک کی گردان

دہرائی۔ اور عادل رشید بے ساختہ ہنس پڑے۔ جس پر

جن پر انھیں غصہ آگیا۔ اور وہ عادل رشید کو گھورنے لگے
 آئندہ نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ”بھئی ہم لے
 بھی بہت پڑھا ہے۔ ہم نے بھی اقبال اور جوش کا مطالعہ کیا
 ہے۔ لندن میں بیٹھ کے جھک نہیں مارتا رہا ہوں۔ مجھے تو عمان
 کیجئے۔ ان میں کوئی عظیم بات نظر نہیں آتی۔ اقبال بہت اچھے ہیں
 لیکن ان کا فلسفہ متضاد خیالات کا مجموعہ ہے۔ اور جوش
 اردو میں تو بہت شور و غل مچاتے ہیں۔ لیکن جب بھی انگریزی
 میں ترجمہ کرو۔ گھاس معلوم ہوتے ہیں۔ بالکل گھاس“

آپ خود گھاس کھا گئے ہیں“ سردار نے غصے میں آکر
 کہا: ”آئندہ صاحب پہلے آپ اس ملک کی حالت کا اندازہ
 کیجئے۔ اس کی ادبی تحریکات کا مطالعہ کیجئے۔ اس کے سیاسی
 رجحانات کا تجزیہ.....“

”دوستو! مہندز ناٹھ نے پیسج کر کہا“ دوستو۔ مار ڈالا۔

کچل کے رکھ دیا۔ دوستو میدان جنگ سے بھگا دیا“
 ”کیا ہوا بھئی؟“ سجاد ظہیر نے سخت پریشان ہو کر

پوچھا۔

کچھ بھی تو نہیں۔ سب نے چسپیں بہ چسپیں ہو کے کہا۔ بس ایک دفعہ اور مات کھلا دیوں۔ جب سے گلا پھاڑ پھاڑ کے چلا رہے ہیں میرے بار۔ پنجابی ڈھنگے ہیں نا آخر تہذیب چھو تک نہیں گئی ہے۔ مٹا ڈیہ بساٹ۔ ہم نہیں کھیلتے۔

لاؤ ہم تمہاری مدد کرتے ہیں۔ علی سردار جعفری نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”یہیت خوب آپ میری مدد کریں گے۔ آپ؟“ سب نے مل کر طعنیہ انداز میں کہا۔

”کیوں مجھے کیا ہوا ہے؟“ سردار نے چونک کر پوچھا۔
 ”آپ؟“ سب نے منہ سے

”ہاں میں!“

”آپ!“

”ہاں! ہاں میں!“ اب سردار کو ذاتی غصہ آگیا۔

”تم!“

”میں!!“

”تم!!!“

”بے شک بے شک“ مدن گویاں نے سر ہلا کے کہا۔ اور

سب ہنس پڑے۔

گفتگو ایک لمبے عرصے کے لئے خود بخود بند ہو گئی۔ سب اظہیر
رفتہ سر دوش، عادل رشید اور مہنڈر ناتھ کسی نہ کسی طرح سو گئے

جب یہ سب سو گئے۔ تو جس پینے والا فقیر کیفی اعظمی اک گو نہ

بے خودی سے سرشار ہو کر گنگنا نے لگا۔ تودس مہبائی چسکی

لے کر یو کاپس کی میٹھی گولی چوسنے لگے۔ آئندہ کسی ٹالسٹائی

کی ROAD TO CALVENY پڑھنے لگے۔ مدن گویاں نے

پریم چند کے ستون اپنا انگریزی شاہکار پھر سے پڑھنا شروع کر دیا

اور اس پرنسپل سے نشان لگاتا گیا۔ گویا دوسرے ایدیشن

کے لئے اُسے نئی نئی باتیں ابھی سے سوچ رہے ہیں کہ سن چند

کا جی پان کھانے کو چاہتا تھا۔ لیکن گاڑی کہیں رکتی نظر نہ آتی تھی۔

اس تے سبب حسن سے کہا دم گھٹا جا رہا ہے۔

اگلے اسٹیشن پر اتر کر ڈائمننگ کار میں چلیں گے“ سبط نے
تجویز پیش کی۔

”میں بھی چلوں گا“ سردار نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ یعنی ڈبے کے بیچ میں خاموشی تھی۔

ورنہ چاروں طرف شور تھا۔ اور کسان اور مزدور اور غریب
بد صورت منفلوک الحال لوگ چلا چلا کے باتیں کر رہے تھے۔ اس قدر

اکیلے، کینے اور بھوکے لوگ وہ تھے۔ کہ اگر نہ چلاتے تو شاید

پاگل ہو جاتے۔ اس خاموشی۔ کائنات کی اندھی بسیط گناہ گار

خاموشی میں دب کر رہ جاتے۔ اسی لئے تو ان کی رُو دھیں“

چیخ چیخ کر اپنی زندگی کا نوہ بیان کر رہی تھیں۔ وہ نہتے تھے

بات کرتے تھے۔ مسکراتے تھے۔ خوش ہوتے تھے۔ غصے میں

آکر مچھتے تھے۔ لیکن بات ایک تھی۔ نوہ، مرثیہ، ذنائی ہوئی،

سنائی ہوئی آرزوں کے ننگے مزار۔ ہر ہنسی کے پیچھے۔ ہر

تبسم کے پیچھے۔ ہر انداز گفتگو کے مرکز میں گویا اپنا سپنہ

کھولے ہوئے کہ رہے تھے۔ ہمیں دیکھ لو۔ جاہل و وحشی

ظالم درندہ۔ ہمیں بھینھوڑ کر کھا جانے والو دیوتا نما شیطانو،

آہ۔ آہ۔ ہمیں قریب سے دیکھ لو.....

کرشن چندر نے منہ پھیر لیا۔ باہر شفق کھل گئی تھی۔

سبٹے کے ذہین چہرے پر کرب کی اک لہرائی۔ اس نے

آہستہ سے کہا۔ وہ دیکھا تم نے.....

سبٹے کے چہرے پر کرب کی بیشمار لکیریں ہیں۔ جیسے سمندر

کا جھاگ ساحل سے ٹکرا کر نچتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح

ذہنی احساسات کا مجموعہ سا لہا سال سے اس کے نازک

چہرے پر یخ بستہ ہونا چلا گیا ہے۔ اس کا چہرہ خفیف سے

خفیف انسانی جذبات کا بھی عکاس ہے۔ اور اکثر ایسا معلوم

ہوتا ہے۔ گویا سبٹے نے زندگی سے کرب ہی اخذ کیا ہے۔ زندگی

کی بے پناہ صوتیوں اور گہری سے گہری مسرتوں سے بھی اُس نے

کرب ہی حاصل کیا ہے۔ غالباً اس کے انداز فکر میں اک ایسی نازکی ہے اور

اس کے احساسات اور جذبات پر اک ایسی شدت کی کیفیت ہے جو اُسے ہر غم سے

اور ہر مسرت سے اک خاص قسم کا درد محسوس کراتی ہے اک عین کلی کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ایسی ہی کیفیت

پیدا ہوئی ہے۔ جیسے ایک نکبت زدہ بھکاری کو دیکھ کے۔
 اس کا چہرہ شدت احساس کا وہ مرکزہ اتصال ہے جہاں حُسن
 اور غربت، دونوں ایک ہی درد کی تفسیر بن جاتے ہیں۔ اپنی
 جوان سالی کے باوجود یہ چہرہ بوڑھا ہو چلا ہے۔ اس میں صدیوں
 کی نینگی آچلی ہے۔ کرب کی ننھی ننھی لاکھوں لکیریں اس چہرے
 کے ہر وزن سے شب دروز جھانکتی نظر آتی ہیں۔ جیسے
 انہوں نے دنیا کے سارے غم کا احاطہ کر لیا
 ہو۔

شفق کے نازک رنگوں کو سبٹے کے چہرے پر وہی مخصوص
 کر بناک کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے آہستہ سے کہا: "وہ
 دیکھو۔۔۔ وہ دیکھو۔۔۔"

کرشن چندر نے شفق کی طرف دیکھا۔ اُنق پر پھولی ہوئی
 سرسوں کی کیا ریاں، کشمیر کی کشت ہائے زعفران۔ اُسے
 بھی شفق بے حد پسند ہے۔ شفق جو اس کے دل میں نہ تھی
 یہ پیلا پیلا سنہرا جادو جو اس کی روح میں نہ تھا۔ یہ

شادابی - یہ رنگینی - یہ حسن کاری جس کے نہ ہونے سے اس
 کارواں رُواں بھوکا تھا..... یہ شفق جواب سونا نہ
 تھی - جواب زعفرانی بھی نہ تھی - جواب گل بہر کے پھولوں کی طرح
 شعلہ بداماں تھی - سورج نیچے ڈھن گیا تھا - بادلوں کا ہر
 غرہ پھول پھول تھا -

سب نے کہا - ” وہ دیکھو..... وہ دیکھو.....“

سیاہ بادلوں کے پیچھے سونا ایل رہا تھا - سیاہ بادلوں کے
 مرکز میں آسمان نیلا تھا - ایک کھڑکی سی کھلی تھی - سمندر پر
 کھڑکی کھل گئی تھی - اور سورج غروب ہو رہا تھا - اور وہ کھڑکی
 میں بیٹھ کر ڈوبتے ہوئے سورج کو تنگ رہا تھا - اور لہریں
 کوچوم کر واپس چلی جا رہی تھیں - یہ نور کی لہریں یہ سورج کا
 سمندر - یہ خدائی کامرکز

وہ دیکھو..... وہ دیکھو

شام بڑھنے لگی - شفق ڈوبنے لگی - تاریکی پھیلنے لگی -

ہر چیز ڈوب جاتی ہے - اس تاریکی کے سمندر میں - وہ سنہرا

سب سے سردار اور کرشن چندر کو معلوم ہوا۔ گویا وہ کسی نئی دنیا میں آگئے ہیں۔ میرا سپید مکلف لباس پہنے صروب کھڑے تھے۔ تین کورس کا انگریزی کھانا۔ اس کے بعد کافی پھر وہ لوگ اخروٹ کھانے لگے۔ صاحب لوگ اخروٹ توڑنے والا ہتھوڑا استعمال کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے اپنے دانتوں سے وہی کام لیا۔ مقابل کے منہ پر تین انگریز فوجی بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے سے شناسا نہ تھے۔ اس لئے بات نہ کر سکتے تھے۔ ہاں وہ ان تہتہ مار کر فہنسے والے ادیبوں کی بد تمیز یوں کو بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان تین انگریز فوجیوں کے ساتھ چوتھی کرسی پر ایک موٹا پارسی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بار بار کہ اٹھتا۔ میں پریشان ہوں۔ میں بے حد پریشان ہوں جیلانی!

ٹھیک ہے۔ ایک انگریز فوجی افسر نے مسکرا کر کہا۔

نہیں تم نہیں جانتے۔ میں زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ میرا ایک لایج بڑی لاؤ۔ آپ بیٹھے

نوٹھینکس، دوسرے فوجی نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری مرضی۔ لیکن میں بہت پریشان ہوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں کس قدر پریشان ہوں۔“
 فوجی افسر اٹھ گئے۔ موٹے پارسی نے سبٹے کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اور کہا: ”بھائی میں بہت پریشان ہوں۔“
 آپ پریشان نہ ہوں۔“ سبٹے نے مشورہ دیا۔“

”کیسے پریشان نہ ہوں۔“ میں تو پریشان ہوں۔ میں اس زندگی سے اس دنیا سے پریشان ہو چکا۔ یہ سب دھوکا ہے۔ سراب ہے۔“ اس نے گلاس ختم کرتے ہوئے کہا۔
 ”بیرا ایک لارج برانڈھی اور لاؤ۔ آپ پیئیں گے؟“
 ”نہیں شکر یہ!“ کرشن چندر نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”آپ کی مرضی۔ مگر میں بہت پریشان ہوں!“
 اتنے میں ایک موٹا پارسی آخری میسر سے اٹھ کر

ادھر آیا۔ دونوں پارسیوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا
 بڑے ٹھٹھے سے "صائب جی" ہوا۔ اور وہ دونوں ایک
 دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

"کیا حال ہے؟" نوزاد نے پوچھا۔

"کیا پوچھتے ہو۔ دوست۔ یہ دنیا ایک دھوکا ہے۔"

صراپا ہے۔ لایا ہے۔ میں تو بے حد پریشان ہوں؟

"آخر ہوا کیا ہے؟"

"ارے بھی۔ امسال ایک کروڑ انکم ٹیکس میں جا رہا

ہے۔ اس سال کے بزنس پر۔ بتاؤ ہم لوگ کیا کمائیں گے۔"

جب اسی فی صدی تو سرکاری منافع میں سے لے جائیگی

i tell you. it is a swindle میں بہت پریشان ہوں

کیس بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ بوائے دو لارج برٹنی

لاؤ؟

اتنا کہہ کر وہ موٹا پارسی میز پر سر ٹیک کر رونے لگا

حیدرآباد سیشن

دوسرے روز صبح چوتھو بجے کھلی تو گاڑی نظام اسٹیٹ
کو درو میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ ایک اندھا لڑکا ہوا
ہو گیا۔ اس نے ڈھنگ کی بے نقاب کا نقشہ اپنا دلہنہ آواز
میں لگا کر بیان کر رہا تھا۔ باہر بیٹوں تک لٹکا کے کھیت
تھے۔ یہ بیٹوں تک

چھوٹی چھوٹی بھاڑ پونڈی کا جھنگ تھا۔ خیرگوشن اور تیز گاڑی
کی آواز سے چونک کر جھاڑوں سے نکل بھاگتے تھے۔

گپڈنڈی پر چرواہا ریوڑ لئے جا رہا تھا۔ اور سیوں کے پاؤں
 سے اڑتی ہوئی گردیں سورج کی کرنیں ایک زریں دھندلکے
 میں کھوئی گئی تھیں، یہی دھندلکا افق پر بھی تھا۔ جہاں
 سورج سرخ لمحات سے سر نکال کر نئے دن کو دیکھ رہا
 تھا۔ چلتی ہوئی گاڑی کو دیکھا تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے
 بھلے ہوئے چہرے دیکھ رہا تھا۔ کھجری کا نغمہ سن رہا تھا
 جو چلتی ہوئی زندگی کو برنبلی موت کا پیغام دے رہی
 تھی۔ مسافر آنے والی موت سے مرعوب ہو کر اندھے کو
 خیرات بانٹ رہے تھے۔ ہزاروں سالوں سے یہی آساکہ
 دہن اور یہی موت کا نغمہ صبح سویرے سارے ہندوستان
 میں گونج اٹھتا ہے۔ چوڑ دو دنیا۔ چار دن کی چاندنی
 ہے۔ پھر اندھیری رات ہے۔ مایا کا جہنم ہے۔ مسافر
 کس بھول میں پڑا ہے۔ ان گنتوں میں سراب ہے۔ اندھیرا
 ہے۔ تاریکی ہے۔ موت ہے۔ زندگی نہیں۔ حرکت نہیں۔
 خوشی نہیں۔ خود اعتمادی کی وہ جگمگاتی ہوئی کرن نہیں جو

انسان کو صبح سے شام تک دنیا کے تکلیف دہ کاموں میں
 بہ مسرت و شادمانی مصروف رکھتی ہے۔ اسی لئے تو یہاں
 ہر فرد شاقہ مست ہے۔ ہر شخص کا چہرہ مست ہے۔ جیسے
 ابھی ابھی اس نے اپنے والد کے انتقال کی خبر سنی ہو۔ اسی لئے
 یہاں ہنسی ہونٹوں سے غائب ہے۔ کرۂ ارض پر شاید
 ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں ہنستا پرتیزی
 میں شمار کیا جاتا ہے۔ اور رونا عین ثواب ہے۔ رونا ہمارے
 نفع میں ہے، ہمارے فلسفے میں ہے، ہمارے سماج میں
 ہے، ہمارے فن میں ہے، ہمارے مذہب میں ہے۔ رونا
 ہمارے تمدن کی مزاج کامل ہے۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا
 .. نا۔ کھجری والے اندھے نے دوسرا رونا شروع کر دیا۔
 اور سروار نے جھلا کر اُسے دُڈنی وی اور کہا۔ ”بس کرو
 اور اگر ضروری کچھ گانا چاہتے ہو تو کوئی کام کی چیز گاؤ۔
 اندھا بے چارہ چند لمحے چپ رہا۔ اُس کے ساتھی نے ادھر
 ادھر دیکھا۔ اندازہ لگایا۔ کہ ڈبے میں مسلمان مسافروں

کی تعداد زیادہ ہے۔ اُس نے اندھے کے کان میں کچھ کہا اور اندھے نے کجھری کی تھاپ سے ایک نعت شروع کی۔ اور سب وہ نعت گا چکا۔ اور صرف مسلمان مسافروں سے پیسے وصول کر چکا۔ تو اُس نے اب دوسری چیز شروع کی مڑلی والے گھنٹھام..... اب کے صرف ہندو مسافروں نے اُسے پیسے دیئے۔ اس وقت گاڑی میں بیٹھا ہوا ہندو اور مسلمان مسافر ایک دوسرے کی طرف خستگیں نکاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ جیسے اُسے کچا کھا جائے گا۔ اور کرشن چندر کو ایسا محسوس ہوا گویا گاڑی کے ڈبے میں اک گہری خلیج حائل ہوئی جا رہی ہے۔ دو قوموں کے درمیان، دو نظریوں کے درمیان، دو زندگیوں کے درمیان، جیسے کوئی سویا ہوا احساس نفرت یکایک بیدار ہو گیا تھا اور سانپ کے پھن کی طرح سراٹھا کر لوگوں کے دلوں میں لہرا رہا تھا۔ ہر چہرہ زہریلا تھا اور کمینہ اور بھوکا۔ جسے وہ لوگ اپنی زندگی کی تمام تر صوبتوں۔ ناکامیوں اور نامرادیوں کے ذمہ دار مخالف

فریق کو ٹھہرانا چاہتے تھے۔ اور اپنی بھوک اور لپستی اور کمزوری اور نامرادی کا انتقام اُس سے لینا چاہتے تھے۔ یکایک گاڑی رک گئی۔ اور اندھا اتر کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا۔ وہاں سے پھر دہری صدا آنے لگی۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائیگا..... کہلی والے..... مری والے گھنشیام..... اور کیفی اعظمی نے اس طرح برا سا منہ بنایا، جیسے کسی نے زبردستی اس کے گلے میں زہر انڈیل دیا ہو۔

مدن گوپال نے سر ہٹا کے کہا ”ظالم نے کیسا اچھا

کلا پایا ہے :

”ہائین !“ یکایک سب ترقی پسند ادیب جھٹاکے اس کے پیچھے پڑ گئے۔ اگر اُن کا بس چلتا تو وہ اُسے اسی وقت گاڑی سے نیچے اتار دیتے۔ لیکن پھر یہ سوچ کے چپ ہو رہے۔ کہ اس آدمی نے منشی پریم چند پر ایک کتاب لکھی ہے۔

ہر طرف بیزار سے چہرے تھے۔ عادل رشید کھٹے

ڈکارے رہے تھے۔ ملک راج آنند منہ پرہات دکھے شریفانہ انداز میں جمائیاں لے رہے تھے۔ مہندر ناتھ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کھجا رہے تھے۔ رفعت سرور ش بے وجہ مسکرا رہے تھے کرشن چندر پانچوں میں دونوں ہات ڈالے سیٹ پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ قدوس اپنے حلق میں پوکلیٹس کی گولی رکھ رہے تھے۔ سبیلے آنکھیں مل رہے تھے۔ اور سجاد اونگھ رہے تھے۔ اور علی سردار جعفری لٹالے باغی روم کی طرف اس طرح بڑھ رہے تھے گویا کسی انقلابی مہم پر روانہ ہو رہے ہوں۔

”مسلم چائے۔ مسلم چائے“ کسی نے پکارا۔

یہاں بہت سے لوگوں نے ایک ساتھ کہا۔ ”لاؤ“
”کتنی چائے؟“

”پندرہ بیس پچیس۔ چالیس۔ جتنی بھی ہو لے آؤ۔“

عادل رشید نے حکم دیا۔

”چائے والے نے کہا۔“ اگلے منٹیشن پر لے گئی۔

اور یہ کہہ کر وہ چلا گیا

اکلا سیشن بیگم پودا تھا۔ اور جب تک یہ لوگ چائے ختم کرتے حیدرآباد کا سیشن آگیا۔ یہاں استقبالیہ کمیٹی کے دس پندرہ ارکان حاضر تھے، اور صبح سویرے یوں چلے آئے پر ہر فروختہ سے دکھائی دیتے تھے۔ ان کے چہرے خوش آمدید کہنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ مگر بشرے سے عیاں ہوتا تھا۔ میاں، اگر انسان ہو تو ابھی واپس لوٹ جاؤ۔ صبح سویرے ہمیں جگایا۔ یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔ بھاڑ میں جائے تمہاری ترقی پسندی۔ یاں حیدرآباد میں ہم لوگ دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتے۔ دکانوں کے دروازے گیا رہ بجے کھلتے ہیں۔ اور بارہ بجے کے قریب کہیں کوئی اکا دکا خریدار سردی میں ٹھمکتا ہوا۔ شیردانی کے

بٹن کا لڑنگ بند کئے اک معذرتی انداز میں گھومتا ہوا نظر آتا ہے اور ایک آپ ڈھیٹ ہیں۔ کہ نوبے ہی سٹیشن پر آدھکے ہیں۔ لعنت !

چند لمحوں تک مہانوں نے میزبانوں اور میزبانوں نے مہانوں کو دیکھا۔ پھر ہونٹوں پر تبسم آئے گئے۔ یہ تبسم بھی خوب ہے۔ کاروباری۔ بخارتی۔ معذرتی، احمقانہ، ہر طرح کا تبسم ہوتا ہے۔ مایوس تبسم، غیارتبسم، محبوب تبسم، منفص تبسم۔ جاہل تبسم۔ عالم تبسم جیسے ہم سب کچھ جانتے ہیں اور آپ نرے چند ہیں۔ کامراں تبسم، جیسے میاں بتاؤ، اب کیا کر دگے نتھاری لونڈیا تو ہم لے اڑے۔ اور تبسم جس میں حسرتوں کی خاک بھری ہوتی ہے۔ ابراہیم جلیس کے چہرے پر یہی تبسم تھا۔ کچھ عجیب قسم کا، ملتجیانہ، ملتیا لالا مایوس تبسم۔ گویا کہہ رہا ہے۔ دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو۔ قد چھ فٹ سے کچھ نکلنا ہوا اس پر ایک فٹ کی اونچی رومی ٹوپی پہن کر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ابھی

کسی سرکس سے نکل بھاگے ہیں۔ یہ شہاب ہیں۔ پستہ قد
گندمی رنگ، گول چہرہ۔ سیدھا سادا۔ لیکن آنکھیں بے حد
زمین۔ گویا کہ رہی ہوں۔ ہم تمہیں پہچان گئے۔ ایک ہی
لحے میں۔ یہ نظر حیدر آبادی ہیں۔ چوڑا سیاہ چہرہ۔
چوڑا ماتھا۔ چوڑا دہانہ۔ بڑے بڑے اچھے ہوئے بال
ہر چیز میں وسعت کا احساس۔ دکن کا مثالی باشندہ جسے
دکن نے خود اپنی وسیع و عریض چٹانوں سے تراشا ہو۔ بیباک
مفتقد۔ بے جھجک تبسم جو خود بخود لبوں پر آیا جاتا ہے۔ نظر
شاعر ہو کر بھی زمین کے اس قدر قریب کیسے ہو سکتا ہے۔ اُس کا
اندازہ اُسے دیکھ کے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ مسلم ضیائی۔۔۔۔۔
پستہ قد۔ سولارنگ، گنجا سر۔ آنکھوں پر دبیر شیشے، ہونٹوں
پر شرمیلی کنواریوں کی سی مسکراہٹ، مسکراہٹ جو کھو جاتی
تھی اور آجاتی تھی۔ پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ اور سامنے آجاتی
تھی اس قدر احساس مسکراہٹ تھی وہ کہ فیصلہ ہی نہ کر سکتی تھی
یہ باہر کے لوگ میرے دوست ہیں یا دشمن۔ اجنبی ہیں یا عزیز

سکرا ہٹ جو کہہ رہی تھی۔ میں اکیلی ہوں۔ میں تنہا ہوں۔ میں نے بہت کچھ کھو دیا ہے۔ سب کچھ کھو دیا ہے۔ پھر بھی میں مصوم ہوں اکیلی ہوں۔ مجھے نہ چھوڑو۔ میں تمہیں اپنا بنانا چاہتی ہوں۔ لیکن مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ اپنے آپ پر اعتبار نہیں۔ اس ذلیل ماحول پر اعتبار نہیں۔ جو آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتا۔ تم میرے رفیق ہو سکتے ہو۔ ہاں۔ ہاں۔۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔۔۔ مجھے چھوڑو نہیں۔ میرے پاس اب اپنا کچھ نہیں۔۔۔۔۔ ایک نام تھا وہ بھی اپنا نہیں رہا۔ ضیائی میرا ایک دوست تھا۔ وہ مر گیا۔ اُس کا نام میں نے اپنا لیا۔ اب وہ مجھ میں زندہ ہے۔ تم میری سہنی اڑانا چاہتے ہو۔ ایلو میں چلی بہنیں تم مجھے نہیں سمجھو گے۔ اس دوست نے مرتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ کہ میں شراب نہ پیوں۔ اُس دن سے میں نے کبھی شراب نہیں۔۔۔۔۔ تم پھر بننے لگے۔ ایلو میں ہونٹوں سے غائب ہوتی جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ تم مجھے نہیں سمجھو گے۔ میں جو مصدومیت کی میراث ہوں۔ میں جو محبت کے آنسو سے پیدا ہوتی ہوں

اور ناکامی کی گودی میں موتی بن کر پھپی رہتی ہوں۔

مسلم صیائی اور مندر ناٹھ گلے ملنے لگے۔

”آپ سے ملنے“ کسی نے کرشن چندر سے کہا۔ اور

کرشن چندر نے مڑ کر دیکھا۔ معمولی قد و قامت کا بے ڈول سا

انسان، چہرے پر اک لایینی، بے مطلب تبسم۔ پُر اسرار تبسم
نہیں کہ جسے آدمی نہ سمجھ سکے۔ بلکہ ایسا تبسم جو اپنی تفسیر میں کسی

طرح اسم مہمل نہ پڑھ سکے۔ بے حد روکھا پھیکا چہرہ، نہ

لبوں پر چمک نہ آنکھوں میں ذہانت نہ پیشانی پر نور۔ چپ

چاپ گم سم۔ مٹی کا مادھو۔ چہرے کا رنگ پیلا، نہیں مٹیلا۔

نہیں خاکستری۔ نہیں کچھ خاکستری کچھ سبز سا۔ بالکل مینڈک

ایسا۔ لاجول ولا۔ کرشن چندر نے دل ہی دل میں کہا۔ اُسے

دیکھ دیکھ کر متلی سی ہو رہی تھی۔ کس کا منہ دیکھنا پڑا صبح

سویرے

”آپ جگر حیدر آبادی ہیں۔ ابراہیم جلیں کے بڑے

بھائی ہیں۔“

”اوہ جگر حیدر آبادی ہیں؛ بڑی مسرت ہوئی آپ سے مل کر۔ کرشن چندر نے مصافحہ کرتے ہوئے اپنے غلیظ کثیف دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر مڑ کر سبٹے کے کان میں۔ ”جگر جہاں بھی دیکھو۔ جلا بھنا ہی ملتا ہے کہنت!“ سبٹے نے سہنس کر کہا۔ ”ہاں حیدر آباد میں ہو یا مراواپڑ میں یا اردو شاعری میں۔ اس کا ایک ہی رنگ ہے۔“

سردار نے سبٹے اور کرشن چندر دونوں کو ڈانٹا۔ ”آئینے میں اپنی صورتیں ملاحظہ فرمائیے ذرا۔ پھر دوسرے پر انگلی اٹھائیے گا۔“

”کچھ بھی ہو مجھے تو اس شخص سے نفرت ہو گئی ہے۔“ کرشن چندر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

”یہ آپ کی بد قسمتی ہے۔ کیونکہ قیام و طعام کے تمام انتظامات جگر صاحب کے ذمہ میں۔“ سردار نے ہر لفظ پر زور دے کے کہا۔

”باپ رے! کرشن چندر چونک کر اچھل پڑا۔“

_____ حیدر گورہ

جس مکان میں مہمان ادیبوں کو ٹھہرایا گیا۔ وہ حیدر گورہ
میں واقع تھا۔ علی سردار جعفری نے کوشش چندر کو حیدر گورہ
جاتے راستے میں ایک محل کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ گذشتہ
مرتبہ اردو کانگریس کے موقع پر ہم لوگ اسی محل میں ٹھہرائے
گئے تھے۔ قیام و طعام کا اس قدر اچھا انتظام۔ بلکہ ضرورت
سے کچھ زیادہ ہی اچھا تھا۔ ہر مہمان کے لئے دو نوکر وقت
کے گئے تھے۔ جو ہر وقت اس کے کمرے کے باہر بیٹھے

رہتے تھے۔ اُس وقت کے نظم و نسق میں جاگیر داری کا مکمل شکوہ موجود تھا۔ اور کرشن چندر نے سوچا اب پروتاریت کی حد ہو گئی ہے۔ دراصل اُسے جگر سے بغض لینی ہو گیا تھا۔ اس لئے اُسے یہ مکان بھی پسند نہ آیا۔ درحالیکہ مکان نیا نیا تعمیر کیا گیا تھا۔ اور پورا مکان ان لوگوں کے قبضے میں تھا۔ کرشن چندر نے دل ہی دل میں متم کو گالیاں دیتے ہوئے سب سے اچھا کرہ اپنے قبضے میں کر لیا۔ باقی تین کمروں میں چھ چھ سات سات آدمی کو لپاں بنا کے بس گئے۔ اور بستروں پر بچھ گئے۔ اونٹن چار پالی تک تو میسر نہیں۔ اور یہ باغیچہ کی کڑی بھی غائب ہے۔ اور نہانے کے لئے برتن بھی موجود نہیں۔ جگر اس کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ اور اُس کے دل کی وحشت بڑھتی جا رہی تھی۔ یکایک اُس نے جگر کو مخاطب کیا " بہت اچھا مکان لیا ہے آپ نے "

" اچی صاحبہ اچی اچی بنا ہے " جگر عصو میت سے

واہ۔ پھر اُسے سجاد ظہیر کے پلنگ کا خیال آیا۔ بنے پلنگ ہی پہ سو سکتے ہیں۔ فرش پر نہیں آخر ان کے لئے پلنگ کیوں منگایا جائے۔ وہ کیوں پلنگ پر سوئیں اور ہم کیوں نہ پلنگ پر سوئیں۔ واہ۔ یہ اچھی رہی۔ کرشن چن رنے سو چا۔ بنے (سجاد) پلنگ پر سوئیں گے۔ تو میں بھی پلنگ پر سوؤں گا۔ بنے کے لئے پلنگ آئے گا۔ تو میرے لئے بھی آئے گا۔ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔ اور یہ جگر صاحب کس صفائی سے مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کے بنے کیلئے پلنگ کا انتظام کرنے کے لئے چلے گئے۔ میں بھی تو ان کا ہمان ہوں۔ ہمان ہوں۔ خاک ہمان ہوں۔ گھنٹوں سے یہاں اس خالی کمرے میں کھڑا ہوں۔ کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے۔ اور بنے کے لئے پلنگ منگایا جا رہا ہے۔ اور میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ میرا ماسٹھا تو اسی وقت ٹھنکا تھا۔ جب میں نے جگر کو سٹیشن پر دیکھا تھا۔ خباثت اس کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے

پلنگ لانے گئے ہیں۔ سجاد ظہیر کے رشتہ دار ہوتے ہیں
 کیا میں یہاں فرش پر سوؤں گا۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ لیکن
 — لیکن۔ میں جب سے یہاں کھڑا ہوں۔ کوئی نوکر بھی
 تو اس کمرے میں جھاڑو دینے نہیں آیا۔ اور دوسرے
 کمروں میں پلنگ بچھائے جا رہے ہیں۔ کون پوچھتا ہے
 مجھے۔ میں کون ہوں جو مجھے کوئی پوچھے گا۔ واصل یہ
 سب سازش ہے۔ مجھے ذلیل کرنے کے لئے یہاں بلایا ہے
 وہ بے چارہ احمد علی ٹھیک کہتا تھا۔ کرشن چندر کو اپنے
 آپ پر رحم آنے لگا۔ اور اُس کی آنکھیں غم و غصے کے
 آنسوؤں سے غمناک ہو گئیں۔ اتنے میں مجلس اسنبالیہ
 کے ایک رکن تشریف لائے۔

”چلتے۔ چائے پی لیجئے۔“

”نہیں۔ میں چائے نہیں پیوں گا۔“ کرشن چندر نے کہا

”آپ چائے نہیں پیتے۔“

”پیتا ہوں۔ مگر اس وقت نہیں پیوں گا۔“

”کیوں کوئی خاص بات ہے“

”جی نہیں۔ مجھے ذرا — پھیپش ہے“

”تو پھیپش میں تو پائے مفید ہوتی ہے“

”ہوتی ہوگی۔ مگر میرے لئے نہیں۔“

”اچھا تو چلئے۔ غوڑا سنا شستہ ہی کر لیجئے۔“

”ناشتہ؟ میں ناشتہ بھی نہیں کروں گا۔“

”چلئے بھائی۔ تکلف نہ کیجئے۔ آپ ناشتہ نہیں کریں گے

تو جگر صاحب مجھ پر خفا ہوں گے۔“

”جگر صاحب کہاں ہیں۔ انہیں میرے پاس بھیج دیجئے۔“

”وہ ابھی آتے ہوں گے۔ سجاد ظہیر کے لئے پلنگ کا

انتظام کرنے گئے ہیں۔“

”نہیں صاحب۔“ یکایک کرشن چندر نے چلا کر کہا۔ ”مجھے

پھیپش ہے۔ سر میں درد ہے، ہلکی ہلکی حرارت بھی ہے۔“

”بخار ہے۔ پھیپش ہے۔ سر میں درد ہے۔ تو ٹھہریئے

میں ڈاکٹر کو بلا کے لاتا ہوں۔“

کرشن چندر نے کہا۔ ”کھڑیے، کھڑیے۔ مگر وہ رکا نہیں اور ڈاکٹر کو بلانے چلا گیا۔

اتنے میں سردار قریب سے گزرا۔ ”یہاں کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو۔ کرشن، چلو ناشتے پر لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اور وہ دونوں بازو میں بازو ڈال کر چل دیئے ناشتے سے فارغ ہو کر جب وہ اپنے کمرے کو گیا۔ تو کیا باہر وہیں پر جگر کھڑے ہیں۔ اور اس کے کمرے میں پلنگ بچھوایا جا رہا ہے۔

جگر نے کہا۔ ”ڈاکٹر ابھی آتا ہوگا۔ میں ابھی بستر کئے دیتا ہوں۔ آپ اس پر آرام کیجئے۔“

اجلاس

کانفرنس کا پہلا اجلاس ، افتتاح کے موقعہ پر سر جینی
نائیڈو صاحبہ کی شعلہ بیانی ، کیا عورت ہے ۔ معمر ہونے
پر بھی آنکھوں کی جواں سالی نہیں کھوئی ، تبسم کی حیرانی نہیں
کھوئی ، روح کی جستجو اور پیہم کاوش نہیں کھوئی ، بدلتا ہوا
زمانہ ہر بار اک نیا مرحلہ سامنے لے آتا ہے ، اور یہ شاعرہ
اس مرحلے کا یوں استقبال کرتی ہے ، گویا وہ مدت سے
اس کی منتظر تھی ، اٹھتی ہوئی لہریں بار بار ساحل سے ٹکراتی

ہیں۔ اور ان روال و وال بلند و بالا موجوں کے تحت پر آپ اس عورت کو دیکھیں گے۔ جس نے ہندوستانی سیاست اور ادب کے بارے میں رنگ دیکھے ہیں۔ فن سے زندگی تک، اور ہوم رول سے اشتراکیت تک۔ وہ کبھی پیچھے نہیں رہی۔ اُس کے قدم کبھی نہیں ڈنگ گئے۔ وہ زمانے سے ہمیشہ دو قدم آگے رہی ہے۔ ممکن ہے اپنے باغیانہ خیالات کی بنا پر اب کے اُسے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میں بھی جگہ نہ ملے۔ سردار نے سب سے کہا۔ سن سب نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے کہا۔ سو کرشن۔ اپنا مقالہ پڑھنے جا رہا ہے ہال میں خاموشی تھی۔ پانچ ہزار آدمی چپ چاپ بیٹھے ہوئے ایک ادبی مقالہ سن رہے تھے۔ اس سے پہلے ایسا نہ ہوا تھا۔ یہاں مشاعرہ نہ تھا۔ خطیبانہ انداز تکلم نہ تھا۔ کوئی گہری فلسفہ طرازی نہ تھی۔ لیکن لوگ خاموشی سے سن رہے تھے، پانچ ہزار آدمی، کالج کے طالب علم۔ سکول کی لڑکیاں، سرکاری ملازم، دکاندار، ریلوے کے مزدور،

پہلے کار۔ ہر طبقے کے لوگ شامل تھے۔ اور خاموشی سے سن
 رہے تھے۔ اور جب مقالہ ہمارے لے کے جاوا
 ایک کے آزادی پسندوں کی تحریک کا ذکر کیا۔ تو ہاں نفروں
 سے گونج اٹھا۔ اور جب ادب میں اشتراکیت کا ذکر آیا۔ اٹھ
 کا ذکر آیا۔ ایک بہتر نظام زندگی کا ذکر آیا۔ عشق کی انقلابی
 ماہیت کا ذکر آیا۔ اور ان طبقوں کا ذکر آیا جن پر ہمارے
 ادب کے دروازے ابھی تک بند ہیں۔ تو سامعین کے دلوں
 کے تار جھنجھٹا اٹھے۔ جیسے مقالہ نگار کی زبان اور ان کے
 دل ہل گئے تھے۔ جیسے اُس مقالے میں وہ لوگ خود بول
 رہے تھے۔ پہلے روز بھی یہ ہوا۔ دوسرے روز بھی اسی
 طرح ہوا۔ تیسرے اور چوتھے روز بھی یہی ہوا۔ یہ مکمل
 اہٹماک، یہ سچائی کو پالنے کی پاکیزہ جستجو ہر چہرے سے
 عیاں نظر آئی۔ گذشتہ دس سال سے لوگ تہذیبی اور
 ادبی کاوشوں کی طرف توجہ دینے لگے ہیں۔ انھیں اپنی قومی
 زندگی کا عنصر سمجھنے لگے ہیں۔ اور گو تعمیری تنقید نے اتنی ترقی

نہ کی تھی۔ پھر بھی باشعور پڑھے لکھے طبقے میں ان ہی باتوں کا
 چرچا تھا۔ نئی تحریروں پر بحثیں ہوتی تھیں۔ بہ نعمت نگاہ ہر
 مضمون کے حسن و قبح پر، اُس کے افادہ یا غیر افادہ
 پہلوؤں پر۔ اُس کے ترقی پسند یا نا ترقی پسند رجحانات
 پر بڑی تفصیل سے گفتگو ہوتی تھی۔ مختلف نظریے تھے،
 مختلف اذہان تھے۔ مختلف زاویہ ہائے نگاہ۔ لیکن ایک چیز
 ان سب میں وجہ اشتراک تھی۔ ادب اور کلچر اور تمدن سے
 دلچسپی۔ حقیقی دلچسپی، اور قومی اور ملکی ادب کو اُس راہ پر گامزن
 کرنے کی آرزو جہاں وہ اُس کی بڑھتی اُٹھتی، چلتی ہوئی زندگی
 کا ترجمان بن جائے۔ ہندوستان کے نوجوان کا دل جاگ
 اٹھا تھا۔ اور ادب کی ہر تفسیر میں اپنی تمناؤں کے فانوس
 خیال روشن کر رہا تھا۔ یہ روشنی جو بڑھتی جا رہی تھی، جو
 اندھیرے پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہی تھی یہ گیت
 جس کے ہر مصرعے میں اک نئی نئی کی چمک تھی۔ اور جس کی
 ہر لے میں کروڑوں انسانوں کی آرزوؤں کی گونج تھی۔ اس

نئے نئے ہر ادیب کے دل کو بہت اور مسرت سے ہریز
 کر دیا اور ان کے دلوں کی دھڑکنیں ان ہزاروں دلوں
 کی دھڑکنوں میں کھوئی گئیں جو اس وقت ہال میں موجود
 تھے۔ روشن چہرے۔ ذہن آنکھیں۔ تالیوں کا شور اور
 نئی زندگی، نیا ادب۔ نئے انقلاب کے نعرے، یکا یک کئی
 ادیبوں نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ گویا
 سب کے دل معاً ہی شدت سے محسوس کرنے لگے کہ ادب
 صرت تختیل کی چار دیواری میں محسوس رہ کر کس قدر محسوس
 ہو جاتا ہے۔ اور اس بڑھتی ہوئی زندگی۔ کشمکش حیات
 کی آویزشوں سے ٹکراتی ہوئی زندگی کے بحرانی لمحوں میں
 گھل جاتا ہے اور ادیب کیسے اک نئی وسعت، اک
 نئے رخ، اک نئے کیف و کم سے سرشار ہو جاتا ہے۔

پہلے اجلاس کے ختم ہونے کے بعد بہت رات گئے
 اجلاس کی کامیابی پر گفتگو ہوتی رہی۔ کالجوں کے لڑکے
 بڑے انہماک سے ادیبوں کی گفتگو سنتے رہے۔ اور
 آٹوگراف لیتے رہے۔ یہ آٹوگراف کی بدعت بھی خوب
 ہے۔ ادیب جلدی میں یوں دستخط کرتے تھے۔ گویا کہہ رہے
 ہوں۔ ارے بھئی۔ ان لوگوں نے تو پریشان کر دیا۔ اب
 کوئی کہاں تک دستخط کرے۔ کبھی کبھی لڑکی کی
 آٹوگراف ہکا آجاتی تو قلم لے کے بیٹھ جاتے۔ اور
 سوچتے کہ کس طرح ایک فقرے میں یہی و مجنوں کی پوری
 داستان بیان کر دیں۔ بعض لوگ بہت ہی کبھی بننے کی
 کوشش کرتے۔ ایں۔ اس میں ہے کیا آخر۔ آخر تو عورت
 ہی تو ہے۔ شوپن ہار والی عورت، جامعات کر دیا تجھے
 دن گویا پال سے کسی نے آٹوگراف نہیں مانگا۔ تو آپ بتیسی
 کھانے ہر ایک سے پوچھ رہے ہیں۔ ”بھئی، اُس خوبصورت
 لڑکی کی بے حد بد صورت آٹوگراف ہکا پر تم نے کیا لکھا

بی بی ہی ہی " اب کوئی پوچھے اس میں ہنسنے کی کیا بات
 تھی۔ آڈوگراف بجک جو مسلم ضیائی کے پاس تھی کئی اعتبار
 سے بہت دلچسپ تھی۔ سجاد ظہیر نے لکھا تھا۔ "اشتراکیت
 زندہ باد" کرشن چندر نے کہا تھا "الساہیت زندہ باد"
 جوش نے لکھا تھا: "ابھی تم دونوں بچے ہو، آگے ساغر فی
 لکھا تھا "تو بڑا چار سو میں ہے" یہاں آ کے تسلسل
 ٹوٹ گیا تھا۔ اور جوش و ساغر کے مناقشات پر گفتگو
 ہونے لگی۔ جوش کی رباعیوں کا ذکر آیا۔ فراق نے بھی رباعیاں
 کہنا شروع کی تھیں۔ موازنہ ہوا۔ اسی جھگڑے میں رات
 کے دو بج گئے۔ صبح ہی سردار کو نظام کالج میں ایک
 تقریر کرنا تھی۔ اُس نے سوچا۔ لاؤ ابھی شیو کر ڈالو۔
 کرشن منتارا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کرشن کا سامان
 غائب تھا۔ اُس نے بہت ڈھونڈا۔ لیکن کہیں نہ ملا۔
 اس نے گھور کر جگر صاحب کی طرف دیکھا۔ جگر نے کوئی توجہ
 نہ کی۔ کرشن چندر کے دل میں نفرت اور بڑھ گئی۔ خوب

اب یہ پوچھنے تک بھی نہیں کہ بھئی آپ کا شیو کا سامان کہاں ہے۔ کیسے کم ہوا۔ یہیں کہیں ہوگا۔ میں ڈھونڈوا دیتا ہوں۔ جگر نے جانی لے کے کہا " میں تو چلتا ہوں۔ صبح فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم تشریف لائیں گے! اور ہمیں تو نظام کالج جانا ہے " کرشن چندر نے کہا۔ گاڑی کا انتظام کر دیجئے۔ " میں دیکھتا ہوں " جگر نے سرسری طور پر کہا۔ اور کرشن چندر کا جی جل کے کباب ہو گیا۔ اور وہ اسی لمحے اپنے کمرے میں جا کے بستر پر دراز ہو گیا۔ اور اُس نے سوچا۔ میں کل صبح نظام کالج نہیں جاؤں گا۔ چاہے مجھے کوئی کچھ ہی کہے۔ میری بلا سے " وہ صبح اٹھا تو شیو کا سامان غائب ہی تھا۔ دوبارہ ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملا۔ سردار بے چارہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے گھوم رہا تھا۔ لیکن کسی کا شیو کا سامان غالی نہ تھا۔ آئندہ ڈارٹھی موڈ رہے تھے۔ سبٹے نیند میں کراہ رہا تھا۔ سجاد ظہیر اپنے شیو کا سامان کسی کو مستعار نہیں

دیتے۔ قدوس صہبائی نے جب دونوں کو نظام کالج کا
 عزم کرتے دیکھا۔ تو بولے۔ ”آپ شیو بنا لیتے تو اچھا تھا
 سنا ہے نظام کالج میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں۔“ سردار کا
 چہرہ تنا ہوا گھونسا تھا۔ اور کرشن چندر کا چہرہ ایک بھوکی
 بھیڑ کا۔ اتنے میں جگر گاڑی لے آئے۔ چہرہ ہر قسم کے
 جذبات سے عاری۔ نہ غم۔ نہ حسرت۔ نہ حیرانی۔ نہ
 دلچسپی۔ نہ وہ ادیبوں سے مرعوب تھے۔ نہ اُن سے
 بیزار نظر آتے تھے۔ جیسے کوئی خاص دلچسپی انہیں ان
 لوگوں سے نہ تھی۔ اور پھر کوئی ایسی اجنبیت بھی نہ تھی۔
 کچھ عجب قسم کی لا تعلق چہرے پر عیاں تھی۔ جسے دیکھ کر
 کرشن چندر اور بھی جھنجھلا گیا۔ اور اپنے چہرے کے بڑھے
 ہوئے بالوں پر یوں ہات پھیرنے لگا گویا جگر ہی نے
 اُس کے شیو کا سامان گم کیا تھا۔

جب سردار اور کرشن چندر نظام کالج سے لوٹے
 تو فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم لکھنؤ سے تشریف

لے آئے تھے۔ یہ سب لوگ کھانے پر بیٹھے عریانی پر
 بحث کر رہے تھے۔ سردار نے آتے ہی قلم ہات میں
 لے کر ایک تجویز اس امر کے متعلق لکھنا شروع کی۔ اور
 بحث طویل ہوتی گئی۔ ذاق حسن کار ہیں۔ اس لئے انھیں
 عریانی سے اتنی نفرت نہیں۔ احتشام کی طبیعت میں نوجوانی
 کے باوجود اتنا ٹھہراؤ ہے کہ وہ عریانی کو دیکھ کر بدکتے
 نہیں۔ برا فرد ختم نہیں ہو جاتے۔ صلواتیں سنانے پر آمادہ
 نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا اندازہ یہ تھا۔ میاں ابھی تم
 بچے ہو۔ کیا طفلانہ باتیں کر رہے ہو۔ ان کے ہشاش
 بشاش چہرے پر مسکراہٹ کی ہر دوڑ دوڑ کے کم بوجائی
 تھی۔ وہ اپنی دائرہی اور وضع قطع سے فرانسیسی معلوم
 ہوتے ہیں۔ اور اپنے درشت انداز تکلم سے بیڈ ماسٹر
 اور آگ بگولہ ہوتے وقت سو فیصدی کیولنسٹ نظر آتے
 ہیں۔ اکثر لوگ غلط بات غلط موقع پر کہتے ہیں۔ یا غلط
 بات صحیح موقع پر کہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم کے

متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح بات کہتے ہیں اور ہمیشہ غلط موقعے پر کہتے ہیں۔ جڈرگھاٹ کالج میں انہوں نے چاروں تقریر کرتے ہوئے طلباء کے مجمع میں کالج کے استادوں کو وہ ڈانٹ بتائی کہ بے چارے اب تک یاد کرتے ہوں گے۔ اسی طرح P.E.N کانسٹریکشن کے موقع پر جب ڈاکٹر ملک راج آنند نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں بھی فرانسیسی انسائیکلو پیڈیا کی طرح ایک تحریک جاری کی جائے۔ تو بہت سے لوگوں نے اس انقلابی تجویز کی حمایت کی۔ ان میں ریاست بیکانیر کے وزیر سردار پانیکار بھی شامل تھے۔ لیکن صرف ایک آدمی کی ہڈ زور مخالفت سے یہ تحریک رہ گئی۔ یہ مخالفت کرنے والا جانتے ہو کون تھا۔ یہی اپنے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب۔ آپ نے اٹھ کر کہا۔ تجویز تو بہت معقول ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ فرانس میں اس تحریک کے چلانے والوں میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ روسو اور دالیٹر۔ یہاں ایسا کون اور کیا

کون ایسا مفکر ہے۔ آپ نے پورے مجمع پر نظر ڈال کر کہا۔ مجھے تو آپ لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اُس پائے کا نظر نہیں آتا۔ اس پر ایک تہقہہ بلند ہوا۔ پھر مجمع میں سے کسی من چلے نے کہا۔ ”اور کیا ڈائیں پر بھی کوئی ایسا آدمی آپ کو نظر نہیں آتا۔“

ڈائیں پر سردجی نائیڈ و تشریف فرمائیں۔ جواہر لال نہرو تھے۔ فلسفہ دان رادھا کرشن، ہرمین اولڈ اور فارسٹر۔ اور ملک راج آنند احمد شاہ بخاری پطرس۔ اور دوسرے لوگ۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈائیں پر نگاہ ڈالی۔ سب کی طرف دیکھا۔ اور پھر مجمع کی طرف مڑ کر کہنے لگے۔ ”ہیں۔ ان میں بھی کوئی نہیں۔“

تھریک گر گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ ڈاکٹر صاحب سچائی

کو اس شدت احساس کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اور

اُس پر اس سختی سے کاربند ہوتے ہیں۔ کہ اکثر اوقات ہمدرد
 جی مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی اُمخیں کوئی پروا نہیں
 وہ ادیبوں کے ہامتا گاندھی ہیں۔ لیکن ذرا عدم تشدد کے
 قائل نہیں۔ اور اگر کبھی ہندوستان میں ایسا قانون نافذ
 ہوا کہ ادیبوں کو ان کی ٹکری۔ ذہنی یا خارجی غلطیوں کی
 سزا ملنے لگی۔ تو اس احتساب کا حکمہ ڈاکٹر صاحب کے
 ہی سپرد ہوگا۔ اُن کی صاف گوئی سے بہت سے لوگ
 اُن سے گھبراتے ہیں۔ لیکن اس میں اُن کی عظمت ہے۔
 اور اگر اس صنف میں کوئی اُن سے ٹکر لے سکتا ہے۔ تو
 وہ حسرت موہانی ہیں۔ جو خوش قسمتی سے اس کانفرنس
 میں تشریف رکھتے تھے۔ اور بلا ناغہ اس کے ہر جلسے
 میں شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ جب ترقی پسند ادیبوں
 کی طرف سے عریانی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی۔
 تو اس کی مخالفت کرنے والے مولانا حسرت موہانی تھے
 اور قاضی عبدالغفار۔ مزے کی بات یہ تھی۔ کہ نوجوان

عربانی کے خلاف تحریک پیش کر رہے تھے۔ اور بزرگ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا۔ کہ اس طرح نوجوان اذہان کی قوتیں مسلوب ہو جائیں گی۔ اور ان کی تخیلی نمورک جائے گی۔ مولانا حسرت موہانی کی پر زور تقریر سے قرارداد مسترد کر دی گئی سب سے بے حد ناخوش تھا۔ کہنے لگا۔ " اماں۔ مولینا کا ہمیشہ یہی رول رہا ہے۔ وہ جہاں گئے۔ لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے گئے۔ جب کانگریس میں تھے۔ تو ہوم رول کے دنوں میں آزادی کا ذکر کر کے کانگریس ہائی کمانڈ کو خائف کیا کرتے تھے۔ اور جب کانگریس نے لاہور کانگریس کے موقع پر مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر لی۔ تو آپ نے اشتراکیت کی بیخ لگا دی۔ اور کانگریس سے ایسے ناخوش ہوئے کہ مسلم لیگ میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے ہیں تو اب بے چارے شریف خان بہادروں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں۔ اور مکمل آزادی کا ریڈ ویوشن پاس

کئے دے رہے ہیں۔ ہر جگہ معیبت میں ڈالتے ہیں یہ لوگوں کو۔ بھی اب اچھا بھلا یہ ریزولوشن پاس ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔۔ ہٹاؤ اب اس قصے کو۔ یہ کہہ کر وہ مرگ گیا اور اُس کے چہرے پر ہزاروں درد کی لکیریں بیکارک نمودار ہو گئیں۔ اور پھر وہ کھکھلا کر سنسن پڑا۔ مگر بھی۔ یہ خوب ہیں مولینا چٹان ہیں۔ بس کسی کی نہیں سنیں گے۔ اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹیں گے۔

دوپہر کو پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ حسین ساگر میں جو کلب ہے وہاں دعوت بھی تھی۔ ادیبوں کو کشتیوں میں سوار کر کے کلب میں پہنچایا گیا۔ در حالیکہ ایک راستہ خشکی سے بھی جاتا تھا۔ غالباً موٹر بوٹ کی نمائش مقصود

تھی۔ کلب کی عمارت جھیل میں تعمیر کی گئی ہے۔ کوئی پچاس
 کے قریب ملازم ہوں گے۔ آٹھ کورس کا کھانا۔ اس دعوت
 پر انصاف کیا گیا تھا کہ غالباً پریم چند اپنی زندگی میں اتنی
 راسلیٹی نہ ملی ہوگی۔ یورپ میں جب ادیب زندہ ہوتا ہے
 تو اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مرنے کے
 بعد اُسے پوچھا جاتا ہے۔ چنانچہ آج پریم چند سوسائٹی
 کا افتتاح تھا۔ قاضی عبدالغفار خان تقریر کر رہے تھے
 اور مرغن کھانے دعوت میں شامل تھے۔ اور جھیل کے
 منظر سے ادیب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ قاضی عبدالغفار
 خان کی شخصیت پر منانت کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے
 لیکن اتنا دبیز بھی نہیں کہ ان کی جہلی خوش طبعی اس
 منانت کے اندر سے جھلک نہ اٹھے۔ منانت ہے لیکن
 بوجھ نہیں ہے، خوش طبعی ہے لیکن کھل کر نہیں ہے
 ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کسی چیز نے، کسی خاص واقعے
 نے۔ یا کسی خاص ماحول نے، ان کے ذہن کے، ان کے

فکر کے ، ان کی فطری صلاحیت کے دو ٹکڑے کر دیتے ہیں ۔ وہ اس پر بھی مجبور ہیں ۔ اُس پر بھی ۔ دونوں رنگ ایک ہی شخصیت میں جھلکتے نظر آتے ہیں ۔ پیرس کی رنگینی بھی ہے ۔ عالمانہ زہد بھی ہے ، شگفتہ انشا پر داندی بھی ہے ، اور فکری سٹراؤ بھی ۔ لباس میں امارت کی جھلک ہے اور گفتگو میں حلم کی چاشنی ۔ تیور جاگیر دارانہ ہیں ۔ اور ذہن باغیانہ ، قاضی صاحب اک ایسے نوجوان ہیں جسے عرصے سے کسی نے گدگدایا نہ ہو لیکن خود اُس کے دل میں شوخیاں چٹکیاں لے رہی ہوں ۔ کاش کوئی مصنف لیٹلے کے خطوط کو گدگدائے ۔ اس طرح کہ وہ بھری محفل میں یاروں کی محفل میں نہیں ۔ ہزاروں لاکھوں معمولی آدمیوں کی محفل میں کھیل کھلا کر ہنس پڑے ۔ یہ گدگدی ایک بہت بڑے شاہکار کا پیش خیمہ ہوگی ۔

— پرانا محل

کرشن چندر نے مسلم صیانی سے پوچھا۔ ”بھئی تم شادی کیوں نہیں کرتے ہو۔ اب تو تمہاری آنکھوں پر عینک بھی آچکی ہے۔“

مسلم صیانی نے اپنی عینک کے شیشوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”تم نہیں جانتے۔ آہ!“

”کون ہے وہ ظالم!“ کرشن چندر نے پوچھا۔

”وہ ہر روز کانفرنس میں آتی ہے۔ آہ!“

گاڑی چار مینار کے گرد گھوم کر ایک نکل فروش کی
دکان پر کھڑی ہو گئی۔ مسلم ضیائی اتر کر گجرے خریدنے
لگے۔

”یہ گجرے کیا کرو گے؟“

”میں اُسے بیچ دوں گا۔ اُسے یہ گجرے بہت پسند ہیں“
”آہ! کرشن چندر نے کہا۔ مجھے اپنی بیوی کیلئے

چوڑیاں خریدنا ہیں۔ اور تھوڑا سا ہیرو اور ایک مراد آبادی
پاندان“

”واہ! یہ سب چیزیں تو قریب ہی کے بازار سے
مل سکتی ہیں۔“ مسلم ضیائی نے جواب دیا۔
”آہ! کرشن نے کہا۔

قریب کے بازار سے یہ سب چیزیں مول لے کر
وہ لوگ واپس ہوئے۔ تو چار مینار کے قریب گاڑی
رک کر ایک طرف کھڑی کر دی گئی۔ مینار پر کھڑی
میں ابھی پانچ زبجے تھے۔ چاروں طرف سیٹیاں بچھ رہی

رہی تھیں۔ سائیکل والے سائیکلوں سے اتر کر۔ گھوڑا گاڑی
 والے گاڑی والے گاڑی ہٹا کر۔ کار والے۔ کار ایک
 طرف کر کے اور پیدل چلنے والے جہاں تھے وہیں رک کر
 جامہ دساکت ہو گئے۔ چاروں طرف جدھر نگاہ جاتی تھی
 خاموشی تھی۔ گہرا سناٹا۔ اور مخلوق کے مہر جکے ہوئے تھے
 اور شیردانیوں کے بٹن گلے تک بند تھے۔ اور آنکھیں آسمان
 کی پہنائیوں کو چھوڑ کر زمین کی پتھریلی سطح پر جھکی ہوئی تھیں
 اور پسینے میں عرق عرق پیشانیاں کسی نظر نہ آنے والے
 خدا کے آستانے کی جبہ سائی کر رہی تھیں۔ یکا یک کہیں
 سے اک سیاہ موٹر گذر گئی۔ مینار کے سامنے کھڑے
 جیسے سپاہیوں نے سلامی اتاری، اور گاڑی بہت
 دور چلی گئی۔ اور یکا یک مینار کے گھڑیال نے پانچ بجائو
 اور یکا یک جیسے ساری فضا کی خاموشی جہن سے ٹوٹ گئی
 اور جھکی ہوئی گردنیں اوپر اٹھ گئیں۔ اور موٹر اور سائیکل
 اور گھوڑا گاڑیاں چلنے لگیں۔ اور دکاندار گاہکوں کو سہوا

دینے لگے۔ اب پھر وہی شور و غل تھا۔ وہی ہاؤس۔ وہی زندگی۔

”کیا ہوا تھا بھئی؟“ کرشن چندر نے ایک چاؤس سے پوچھا۔ جو اُس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

چاؤس نے اُسے گھور کر دیکھا۔ اور اپنی تلوار کے دستے پر ہات رکھ کر کہا، ”ابھی سرکار کی سواری ادھر سے

گزر کر گئی ہے۔ اندھے ہو کیا تمہیں اتنا بھی معلوم نہیں؟“

”چلو۔ چلو۔ گاڑی بڑھاؤ۔“ مسلم ضیائی نے میٹھی

واے سے کہا۔ اور پھر مڑ کر کرشن چندر سے کہنے لگا۔ ”یہ

چاؤس آزاد عرب کے لوگ ہیں۔ اُن سے ”یا چاؤس“

کہہ کے گفتگو کرنا چاہئے“ بھئی ”کہہ کے نہیں۔ وہ تو یوں

کہو۔ شریف چاؤس تھا۔ لڑاکا ہوتا تو ابھی اس بات پر

تمہارے پیٹ میں چھری بھونک دیتا۔

”یا چاؤس!“ کرشن چندر نے گھبرا کر کہا۔ اب

کہاں چلو گے؟“

”راجہ شامراج جی کے ہاں دعوت ہے۔ چھ بجے!“

راجہ شامراج کا محل - پرانا محل - شہر میں واقع ہے
 اونچی فصیل کے اندر ایک خوشنما باغیچہ ہے۔ باغیچے میں
 ایک مور تاج رہا تھا۔ جب ادیب لوگ وہاں پہنچے
 تو دس بارہ موٹریں ایک طرف استقبال کے لئے کھڑی
 تھیں۔ راجہ صاحب غائب تھے۔ ادیبوں کو موٹر ڈرائیور
 سپاہیوں اور راجہ صاحب کے مصاحبوں نے بھک کر
 سلام کیا۔ اور یہ بے چارے کچھ حیران۔ کچھ پریشان،
 کچھ پشیمان سے۔ محل کی سیڑھیوں پر کھڑے کے کھڑے
 رہ گئے۔ اتنے میں کسی نے کہا۔ اوپر تشریف لائیے۔
 ادھر لائبریری کی طرف، یہاں راجہ صاحب سے تقاضا

ہوا۔ بظاہر صدق و صفا کی صورت۔ دُبے پتلے، پشیمانی
 پہ تنک، اتنی بڑی لائبریری، اتنی اچھی لائبریری ہر
 موضوع پر کتابیں جنہیں غالباً آج تک کسی نے کھول کر پڑھا
 نہ تھا۔ بہت سی کتابوں کے ورق بھی کاٹے نہیں گئے
 تھے۔ پوری لائبریری میں صرف دو بچے پڑھ رہے تھے
 یہ سنگ مرمر کے مجسمے تھے اور ایک سنگ مرمر کی کتاب
 کھولے ہوئے اُس پر جھکے ہوئے تھے۔ اور نہ جانے
 کتنے سال سے اس طرح جھکے ہوئے اسی کتاب کے
 اسی صفحے کو پڑھ رہے تھے۔ یہ سنگ مرمر کے صفحے۔
 یہ سنگ مرمر کی کتاب۔ یہ سنگ مرمر کے محل، لیکن
 ہم لوگ یہاں کیا کر رہے تھے۔ کیوں اس دیا ر غیر میں
 جنیوں کی طرح گھوم رہے تھے۔ وہ گھر جو اپنا نہ تھا۔ جس کے
 ہر سنگ مرمر کی رگ کا خون سفید ہو چکا تھا۔ سامنے مورناج
 رہا تھا۔ ایک کمرہ اشتراکیت کے موضوع سے متعلق تھا۔
 یہاں ہزاروں کتابیں جمع تھیں۔ مصاحب ہمیں اس طرح دیکھو

رہے تھے۔ گویا ہم تماشہ ہوں اور وہ تماشائی۔ ان کی نظریا
 گویا کہہ رہی تھیں۔ تمہارے ایسے سینکڑوں لوگ یہاں
 آتے ہیں۔ اور دعوت کھا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ یہاں ہم
 ادیبوں کو بلاتے ہیں۔ اور سرکس والوں کو بھی اور مارپیوں کو۔
 اور مسخروں کو، یا سیاح آتے ہیں اور بھک بنگے بھی۔ اور
 سیاست داں بھی۔ ہمارے راجہ صاحب سب کو دعوت پر
 بلاتے ہیں۔ ہمارے راجہ صاحب بہت اچھے ہیں۔ لیکن ان
 اچھا ہونے سے آپ لوگ اچھے نہیں ہو سکے۔ سردار صاحب
 آپ کی قمیص پھٹی ہوئی ہے۔ آپ کی شیردانی کا بٹن غائب
 ہے سبٹے میاں۔ قدوس صاحب آپ نے یہ جھولا کیسے
 ٹسکا رکھا ہے۔ مہندر بھائی آپ نے سر پر یہ جھنگل سا کیا
 اگا رکھا ہے۔ کرشن صاحب آپ کی تپلون پر دس پیوند ہیں
 آپ لوگ یہاں کیا کھا کر ترقی پسندی کا دعویٰ کریں گے۔۔
 سامنے مورناج رہا تھا۔

ایک صاحب جو غالباً راجہ صاحب کے وزیر معلوم ہوتے تھے بولے۔ ”سرکار کا عجائب گھر بھی دیکھئے گا۔“

سرکار کا عجائب گھر۔ اس وقت تو یہ سارا محل عجائب گھر معلوم ہو رہا تھا۔ جس میں نمونے کے طور پر ترقی پسند ادیب مختلف کمروں میں رکھ دیئے گئے تھے۔ اس بالکونی میں سجاد ظہیر۔ ڈاکٹر تارا چند اور ملک راج آنند قید تھے۔ اس کمرے میں سردار اور عادل رشید سبھت حسن اور رفعت سروش محبوبس تھے۔ اس شیشے کی الماری کے قریب کرشن چندر، ندن گوپال اور فراق گورکھپوری استاد تھے۔ فراق صاحب کے چہرے پر عنیض و غضب کے آثار نمایاں تھے۔ اور ان کی گول گول تپلیاں حیرت و استعجاب میں ڈوب کر ادھر ادھر مجذوبانہ انداز میں تک رہی تھیں۔ ایں۔ ہم لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ہم دعوت کھانے آئے ہیں۔ یا اپنا خون پینے آئے ہیں۔

راق بولے۔ بلند آواز میں۔ ”بھئی میں تو چلتا ہوں؛“

یہ کہہ کر وہ چلے۔

”ٹھہریے۔ ٹھہریے۔“ وزیر نے کہا۔ ”وہ راجہ صاحب کا
عجائب گھر!“

”اچھا صاحب۔“ فراق صاحب نے ہار مان کر کہا۔ وہ
بھی ہو جائے۔“

ایک کمرے میں پتھر کے بُت۔ ایک کمرے میں دیوتاؤں
کے بُت۔ پتھر کے نہیں دھات کے۔ ایک کمرے میں آصفیہ
خانہان کے خطوط جو راجہ صاحب کے بزرگوں کو لکھے گئے
تھے۔ راجہ صاحب کے بچوں کے خط۔ جو انہوں نے اردو
میں لکھے تھے۔ یہ خط شاید اردو سے محبت کے ثبوت میں
تھے۔ ایک کمرے میں مختلف تصاویر۔

وزیر نے کہا۔ ”مجھے وہ تصویر بہت پسند ہے۔“
کوئی خاص بات اس تصویر میں نہ تھی۔ ایک خوبصورت
عورت کی تصویر تھی۔ جس نے ایک سپید ساڑھی پہن رکھی
تھی۔ اس طرح کہ ساڑھی کے اندر عورت تقریباً ننگی نظر

آتی تھی۔ کمر کے خم میں گاگر لئے کھڑی تھی۔
 بے حد پسند ہے۔ وزیر کے ہونٹ کھلے تھے۔ ہائے
 وہ موٹے موٹے کھلے کھلے بد صورت ہونٹ !
 سامنے مورناچ رہا تھا۔

”میں جا رہا ہوں بھئی کرشن۔“ فراق نے جھلا کے کہا۔
 ”ٹھریئے۔ ٹھریئے وزیر نے گھبرا کے کہا۔“ چائے
 پی کے جائیئے !
 ”ہوں“ فراق صاحب نے کھرج میں کہا۔ اور باغیچہ
 میں جا کے چائے پینے لگے۔

چائے پینے کے بعد راجہ صاحب کے ساتھ ترقی پسند
 ادیبوں کا فوٹو کھینچا گیا۔ دائیں طرف سجاد ظہیر۔ بائیں طرف
 کرشن چندر اور کرسیوں پر دوسرے ادیب اور بہت سے
 ادیب مصاحبوں کی طرح پیچھے کھڑے تھے۔ سردار اور
 سبٹے اور دوسرے انقلابی ادیب۔

”میں حاضر ہوں سرکار“ فوٹو گرافر نے کہا۔

راجہ صاحب نے اشارہ کیا۔ اور فوٹو لے لیا گیا۔

فراق کے بدن میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ لیکن اب

فوٹو لے لیا گیا تھا۔ فوٹو جو بے حد ضروری تھا۔ فوٹو سے

راجہ صاحب کی ترقی پسندی تو کیا ظاہر ہوتی تھی۔ اپنی ذلت

پسندی کی انتہا ہو گئی تھی۔ سردار نے کہا۔ اگر مجھے معلوم

ہوتا۔ سبٹے بولا۔ انقلاب کے دوران میں جاگیر دار ایسے

ایسے کئی فوٹو پیش کر کے اپنے آپ کو اشتراکیت کا عمیر

ثابت کریں گے۔ ادمنہ، ان باتوں سے کیا ہوتا ہے۔

قدوس صہبائی بولے۔ فوراً گردن ناپ دی جائے گی۔

مگر ایسا ہوا کیوں؟ دن گوپال چٹھے۔ ہم یہاں آئے

کیوں؟ فراق بولے۔ اگر کوئی میرے ساتھ چلتا ہے

تو چلے۔ ورنہ میں تو ابھی چلا۔

”ٹہریئے۔ ٹہریئے“ وزیر نے چلا کر کہا ”پان اور

عطر حاضر ہے“

سونے کا عطر دان اور چاندی کا پاندان۔ اور پان کھلا کر
 اور عطر لگا کے اور بات میں ایک گلدستہ تھا کے ادیبوں
 کو رخصت کر دیا گیا۔ چلتے وقت یہ محسوس ہو رہا تھا۔ گویا کسی
 منہ پر ٹھوک دیا ہے۔ پیشانی پر کیچڑ مل دی ہے۔ اور
 روح میں غلاطت کے آثار لگا دیئے ہیں۔ ہر شخص آؤ کا بیٹھا
 معلوم ہو رہا تھا۔

سامنے مورناچ رہا تھا۔

واپس قیام گاہ پہنچ گئے۔ تو دیکھا سامنے صحن میں
 جگر حیدر آبادی کھڑے کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ کئے حساب
 راجہ صاحب کی دعوت سے فارغ ہو گئے۔

اس کے بعد پیسے۔ ہونٹ لال۔ مسوڑھے لال۔ دانت

لال۔ زعفران رنگ چہرے پر رستا ہوا سرخ زخم۔ جی میں

آیا کلا گھونٹ دیا جائے۔ سردار نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں
 بھینچ لیں۔ اور اپنے آپ پر بے حد جبر کر کے بولے۔ بندہ
 خدا بنا تو دیا ہوتا۔ کہاں دعوت ہے۔ ہمیں کیا معلوم یہ شامراج
 کون ہے ؟ ... ہم تو سمجھے تھے کوئی ادب نواز صاحب
 ہوں گے۔

”ادب نواز تو وہ ہیں ورنہ آپ کو بلاتے کیوں ؟“
 یہ یہ تو ٹھیک ہے مگر۔۔۔ مگر یہ راجہ۔ یہ نواب
 یہ یار جنگ بہادر۔ تم کچھ سمجھو گے بھی کہ نہیں ؟
 جگر گھوم گئے۔ مٹھیاں کی طرف جاتے ہوئے بولے
 ”آپ کے لئے شام کے کھانے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔
 شام کے کھانے سے پہلے اردو مجلس کے ہاں سے تمام
 سندھوین کو بلاوا آیا ہے۔ جانا ہوگا۔“

وہ مڑ کر گھوم گئے۔ فراق نے انھیں سعادت نہیں کیا
 تھا۔ اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے بولے۔ یارو عجب
 آدمی ہے۔ چوبیس گھنٹے سر پر سوار رہتا ہے۔ جب دیکھو۔

لہجے میں ضرورت سے زیادہ تلخی تھی۔ حسد اور رشک اور اک
 مجبور۔ گرا بنا۔ حریصانہ رقابت۔ کہ ہائے میں شاعر کیوں نہیں
 یہ ہر محفل میں شاعر کیوں پھا جاتا ہے۔ اور کیوں افسانہ سننے ہی
 لوگوں کو جاہلیاں آنے لگتی ہیں کاش میرا ہر افسانہ فراق کی
 رباعی کی طرح خوب صورت ہوتا۔

_____ بطون کے ساتھ ایک شام

شام اور رات کے بیچ کے وقفے کی دھندلی دھندلی
اُواسی، ادیبوں کی پھلکی پھلکی اکتائی ہوئی، تھکی ہوئی صورتیں۔
مرزا فرحت انڈ بیگ کے وسیع و عریض برآمدے کے باہر
بطون کا بے ہنگم خرام، اردو مجلس میں چائے اور مشاعرے
کا بندوبست۔ شاعروں کی آوازیں اور چینی کے پیالوں میں
چلتے ہوئے چمچے۔ اور سرکیوں کے پیچھے پردہ پوش خواتین
کی کڑی تنقید۔

ہائیں۔ یہ کرشن چندر ہیں۔

کون وہ ٹھکنے سے اری وہ.....

کرشن چندر نہیں (چند چندر) معلوم ہوتے ہیں۔

تہقید۔

کرشن چندر کا کھانا سنا۔ وہ کھانسی گویا کہہ رہی ہو۔ دیکھئے

ہم بھی سن رہے ہیں۔

عادل رشید اس طرح بیٹھے ہوئے تھے گویا میر مشاعرہ

ہی تھے۔

قدوس مہبانی — گویا ابھی چوتھے درویش کی

سرگزشت سنا کے سٹارہے ہوں۔

فضا میں اُچلے پن کے باوجود تیرگی۔ عرصہ زماں میں

سال کے باوجود ماعنی کا دھندلکا۔ متکلف محبت کے باوجود

اک کھینچاؤ۔ جیسے رگین ٹوٹ رہی ہوں۔ جیسے دو زمانے

دونسیلیں۔ اور دو زاویہ بائے ایک دوسرے کے قریب

آنے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں۔ جیسے اندھیرا اُجالے

میں اور ارضی مستقبل میں اور موت زندگی میں اپنا کس ڈھونڈھ
رہی ہو۔

کیسی نے اپنی نظم مرثیہ خوانوں کے انداز میں سنائی۔
خاموشی گہرا سناٹا۔

ایک پیر و مرشد نے اپنی وارسی پر بات پھیر کر کہا،
آپ شاعر ہیں۔

پھر خاموشی، لوگ اس جملے کی اہمیت پر غور کر رہے
ہیں۔

سب سوؤب بیٹھے ہوئے ہیں، گویا کسی ایٹم بوم کا
انتظار کر رہے ہیں۔

پھر کسی نے کہا، میرزا صاحب آپ کچھ سنائیے۔

میرزا صاحب سنانے لگے ”جنا کا کنارہ“

حریرینی پر دوں کے پیچھے کسی نے کہا، کنارہ نہیں،

کنارہ کہئے۔

تہذیب اور کلچر موت کے زہراب میں گرفتار ہوں۔

لیکن گرامر نہیں بدل سکتی۔ زندگی بدل جائے لیکن زبان کی
 ہدایت نہیں بدل سکتی۔ زمان و مکان میں تغیر کی نحو ہو سکتی ہے
 ملک و ملت اور افراد و کردار کی ہدایت میں۔ اطوار و گفتار
 میں۔ اُن کی سماجی۔ سیاسی۔ شعوری زندگی میں انقلاب آ سکتا ہے
 لیکن زبان میں کوئی تغیر ممکن نہیں۔ وہ موت کی طرح اور
 خدا کے آخری حکم کی طرح قطعی ہے۔

اے ستانی مغایہ کو پوجنے والی مخلوق۔ سر جھکا کر
 مودب سٹی رہ۔ اس کی نکرہ کر کہ سر سے طوفان گزرا جا رہا
 ہے۔ قاسم کی بیش قیمت چائے دانوں میں اُلتی ہوئی
 چائے انڈیل۔ صحن میں آہستہ خرام کرنا کڑا تھی ہوئی پرموت
 بطنوں کو دیکھ۔ اور سن۔ جہنا کا کنارہ — نہیں نہیں۔

جہنا کا کنارہ ! معاف کیجئے گا۔۔۔

کرشن چندر نے جھک کر نگر کے کان میں کہا۔ خود کشی
 کے لئے کون سی جگہ بہتر رہے گی۔

نظر نے بہت سوچ بچار کے بعد کہا۔ ویجا جی کا ہول۔

تو چلو پھر وہیں ۔

آخر کا نفرنس ختم ہو گئی ۔ سب نے فن صحافت پر اپنا
 مقالہ بھی پڑھ لیا ۔ کسی شخص نے اُسے ٹوکا نہیں ۔ سردار نے
 اقبال کے رجعت پسندوں نقادوں کو آڑے ہاتھ لیا ۔ کسی نے
 اس کے پیٹ میں چھرا نہیں بھونکا ۔ ڈاکٹر تارا چند نے اردو
 کا شجرہ نسب دو ہزار سال کے پرانے ہندوستان کی تنہا
 سے جا لایا ۔ کسی ہندو ماہا سبھائی نے اُن تک نہ کی ، لیکن جب
 کا نفرنس ختم ہونے کے بعد مخدوم نے آہستہ سے کہا ۔ بھئی
 وہ ریلوے کے مزدور تم لوگوں کو اپنے جلسے میں بلانا چاہتے
 ہیں ۔ تو بہت سے لوگ زکام اور چھین اور بخار سے بیمار
 پڑ گئے ۔ بلکہ صاحب نے بڑی مستعدی سے لوگوں کے

بستر باندھنا شروع کر دینے۔ کچھ لوگ بازار میں خرید و فروخت کرنے چلے گئے۔ کچھ لوگ P. E. N کا نفرنس میں شرکت کرنے کے لئے سٹیشن سے جے پور کا ٹکٹ لانے کے لئے چلے گئے۔ کچھ لوگ پیار ہو کر بستر پر دراز ہو گئے۔ مزدوروں کے جلسے کے لئے سرف کیسی۔ سردار۔ اور ساحر بیچے۔

مخدوم نے تعارف کرایا یہ کیسی ہیں۔

انقلاب زندہ باد

یہ سردار ہیں۔

انقلاب زندہ باد

یہ ساحر لدھیانوی ہیں۔

انقلاب زندہ باد

مشینوں پر کام کرنے والے لوگ۔ سانولے کالے لوگ، موٹے موٹے جیڑوں کھر در سے بات پاؤں والے لوگ بد صورت لوگ۔ غلیظ لباس پہننے والے لوگ۔ بُرا کھانا کھانے والے لوگ۔ لوگ جو نہ ”واقف“ کہہ سکتے تھے

نہ "مکرر ارشاد" نہ "سننے کیا شعر ہوا ہے" لوگ جن کے
 آداب اُن کی زندگیوں کی طرح کھر درے تھے۔ اُن کے لباس
 کی طرح وحشی تھے۔ اور اُن کے اعتقاد کی طرح مضبوط تھے
 یہ لوگ جو خوبصورت الفاظ میں شاعروں کی تعریف نہیں کر سکتے
 تھے۔ جو خاموش تھے۔ اور سن رہے تھے۔ اور مکرر ارشاد
 نہ کہنے کے باوجود اُن کے چہروں کی آب اور ان کی آنکھوں
 کی چمک، اور اُن کے ہونٹوں کی مسکراہٹ گویا کہہ رہی تھی
 ہم خوش ہیں۔ کیونکہ تم ہمارے ہو۔ ہم میں سے ایک ہو۔
 ہماری خوشیوں اور غموں کے گیت گاتے ہو۔ اور اپنے
 الفاظ کی حسین نقویروں میں ہمارے دکھ کا مداوا ڈھونڈتے
 ہو۔ تم ہماری برادری میں سے ہو۔ اُس انسانوں کی عظیم
 برادری میں سے جہاں کسی انسان کا حق دوسرے انسان
 کے حق پر خالق نہیں سمجھا جاتا۔ آؤ۔ آؤ۔ ہم تمہارا استقبال
 کرتے ہیں۔ چمکتی ہوئی آنکھوں سے۔ خاموشی کا پتے ہوؤ
 ہونٹوں سے اور بھینچی ہوئی مضبوط مٹھیوں سے۔ خوش آمدید

ساتھیو۔ اب تک تم ویرانے میں گھومتے رہے۔ آج تم گھر
 میں آئے ہو۔ ہمارے پاس خریدی پردے نہیں۔ منگی
 دیواریں ہیں، سونے کے پلنگ نہیں۔ پتھر کا فرش ہے۔
 ہماری جیبیں خالی ہیں۔ لیکن دل آنسوؤں سے معمور ہیں۔
 محبت کے آنسو۔ شفقت کے آنسو۔ رفاقت کے آنسو!

..... آؤ..... آؤ..... ساتھیو!

ساحر لدھیانوی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور وہ شعر
 کہتے کہتے رک گیا۔ اور اس کی مناک آنکھوں میں جیسے
 سارا مجمع ناچ گیا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ
 اپنے گھر میں بیٹھا ہوا اپنے عزیز دل سے گلے مل رہا ہو۔
 یہ اُس کی ماں تھی۔ یہ بھائی۔ یہ بہن۔ یہ بچپن کا محبوب ساتھی۔

آؤ..... آؤ..... ساتھیو!

_____ والیسی

اب وہ لوگ فارغ ہو کر حیدرآباد کے سٹیشن پر پہنچ گئے تھے۔ ریلوے کے مزدوروں نے تقرڈ کا ایک چھوٹا سا ڈبہ ان کے لئے وقف کر دیا تھا۔ تاکہ انہیں دوران سفر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اب اس کمرے میں ان کا سامان رکھا ہوا تھا۔ سٹیشن کا پلیٹ فارم تقرڈ کلاس کی مخلوق سے اٹا ہوا تھا۔ اور غلیظ بستروں اور زمگ آلود سیاہ ٹرنکوں۔ بدبو دار ٹوکروں اور کھانچوں سے ایک غلیظ مال گودام کی صورت

میں سبدل ہو چکا تھا۔ جالی والی ٹوکریوں میں مرغیاں
 کرکڑا لہی بھتیں۔ اور ان کے قریب سیاہ خام گھٹنیں اپنی
 کمر کے گرد لپیٹی ہوئی مرہٹی ساڑھی کے پتوں سے جوئیں چھیننے
 میں مصروف تھیں۔ اتنے میں زور سے ایک موٹر کے بارن
 کی آواز کانوں میں آئی۔ اور ایک سیاہ رنگ کی سیڈان سٹیشن
 کے پلیٹ فارم پر جہاں موٹر گاڑیوں کا آنا منسوخ ہے
 چلتی ہوئی دکھائی دی۔ پل۔ پل۔ آگے سے ہٹ جاؤ۔
 پل۔ پل۔۔۔ پولیس کے آدمی جھڑپتے ہوئے
 لوگوں کو پرے ہٹانے لگے۔ قلی اسباب راستے سے اٹھانے
 لگے۔ راستہ صاف ہوتا گیا۔ پل۔ پل۔ موٹر پلیٹ فارم
 پر چلتی گئی۔ اور آخر اک ایسے ڈبے کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی
 جو کسی بڑے آدمی کا سپیشل سیلون معلوم ہوتا تھا۔ کار میں
 سے پہلے سنہری دروی میں لمبوس ایک اردنی اُترا۔ پھر اس
 کار کے دروازے کا پٹ کھولا۔ اور۔۔۔ جب تک پولیس
 کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال لیا۔ اور پھر کوئی

کچھ نہ دیکھ سکا کہ کیا ہے۔

کیا ہے؟ - ایک نے پوچھا۔

سر سلطان با نقابہ کا پیشیل سیلون ہے۔

سر سلطان احمد جو دائرے کی کونسل کے ممبر ہیں

جی ہاں وہی۔

یہاں حیدرآباد میں کیا کرنے آئے ہیں۔

اپنے کسی عزیز کی شادی یہاں کرنے آئے تھے

وہ دن کے لئے کپھارٹمنٹ ہے۔ اور یہ باہر کیا رکھا

ہوا ہے دیکھتے نہیں ہو۔ یہ جہنم کا سامان ہی تو ہے۔

مرغی کے بدبودار ٹوکروں۔ اور عظیم جام سے

بھری ہوئی کھانچنیوں اور رنگ آلود ٹرکوں سے نظریں

پھسلتی ہوئی اس ساز و سامان پر پڑیں جہاں چاندی کے

برتن پڑے تھے۔ اور اخروٹ کی مین قیمت چیزیں۔ اور

روپے پاویں والے پیگ۔ اور صراحیاں جن پر طسانی

آب و رنگ تھا۔ اور پھر وہاں سے نظریں پھسلتی ہوئیں جوئیں

چینی ہوئی مٹیالی کالی سلونی غلیظ گھاٹوں کے جموں کو
 بہ انداز متفرد دیکھتی ہوئیں اُس کھر کی کے باہر جا کر رک گئیں
 جہاں ریشمی پردہ لہرا رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ ریشمی پردہ
 کہہ رہا تھا۔ آگے مت جاؤ۔ یہ ریشم کی دیوار ہے۔ اس
 دیوار کے ادھر نتھاری دُنیا ہے۔ غریبی کے متعفن کیچڑ میں
 کلبلاقی ہوئی مخلوق، ریشم کی دیوار کے اس طرف
 دوسری دُنیا ہے۔ جس کی ہر سانس میں آسودہ تعیش
 کی قطر ہے۔ ہر تبسم میں کامراں انگوں کی شراب ہے
 ہر نئے میں فتح کا مغزور نعمہ ہے۔ اور ان دونوں دنیاؤں
 کے بیچ میں ایک پتلی شفاف سی ریشم کی دیوار ہے۔
 اتنی پتلی اور ایسی شفاف کہ لوگ آریار دیکھ سکتے ہیں۔
 اس دُنیا کے لوگ اُس دُنیا کے لوگوں کو ادا اُس دُنیا
 کے لوگ اس دُنیا کے لوگوں کو اجنبی نکا ہوں سے۔
 دشمن نکا ہوں۔ نفرت کی نکا ہوں سے ہک رہے ہیں۔ تک
 رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں۔ ڈر رہے ہیں۔ لیکن کوئی ادھر سے

اُدھر یا اُدھر سے اُدھر نہیں آتا۔ کوئی۔ کوئی اس پتے شفا
سے پروے کوہات کے ایک ہی جھلکے سے چاک کرنے کی
ہمت نہیں کرتا۔

آؤ۔ آؤ۔ سلما بھیر۔ ویکو۔ یہ مر سلطان احمد کا پیش
سیلون ہے۔ تھما۔ غنڈ کلاس کا ڈبہ ہے۔ یہ ان کا سبز
درسی میں ملبوس میرا ہے۔ یہ پھٹے ہوئے کاروں والا
علی سردار بھنری ہے۔ یہ انڈسٹ کا میز ہے۔ جس پر کشمیر
کے کارگروں نے حسین پچی کاری کی ہے۔ وہ رفعت سروش
کا بھرا بستر ہے جس میں درجنوں چونڈ لگے ہیں۔ یہ طلانی
دراہی ہے۔ وہ تانبے کا ٹوٹا ہے۔ یہ گھوڑا کی رضائی
ہے۔ وہ کھدر کی اورٹھنی ہے۔ یہ موت ہے۔ وہ اندگی
ہے۔

یہ ماضی ہے . وہ مستقبل ہے .

یہ اندھیرا ہے . وہ اجالا ہے .

دیکھو . دیکھو . وہ دیوار ٹوٹ گئی . موت زندگی
 ماضی مستقبل اور رات سحر سے گلے مل رہی ہے .
 لیکن میں . دیوار کہاں ٹوٹی ہے . یہ تو گاڑی چل
 رہی ہے . آہستہ آہستہ . لوگ الوداع کہہ رہے ہیں . مسلم
 ضیائی کی آنکھوں میں آنسو ہیں . ابراہیم علیہ السلام کے رخساروں
 کے گڑھے اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں . نظر کے بال اور
 بکھر گئے ہیں . اور بشریتِ انسانی کی خوب نگاہیں کھ رہی ہیں . ہم
 شرمندہ ہیں . پہلے شرمندہ ہیں . نہ جانے کیوں .

گاڑی چل رہی ہے .

جگر صاحب بات بنا کر جلسے سے کہہ رہے ہیں۔ میں
 بہت جلد گاڑی سے لوٹ آؤں گا۔ اور چھوٹی بہن کو ساتھ
 لیتا آؤں گا۔ نکر نہ کرنا۔ اچھا ہے۔ اپنے مہانوں کے
 ساتھ جا رہا ہوں۔ تھوڑی دُور ساتھ رہے گا.....
 میرا خیال ہے اب وہ اچھی ہو گئی ہوگی چھوٹی بہن.....
 گاڑی چل رہی ہے۔

سورج ڈوبتا جا رہا ہے۔

سورج ڈوب گیا۔

حیدرآباد غائب ہو گیا۔

گاڑی پھر بھی آہستہ آہستہ چل رہی تھی گویا اُن
 پھک ننگوں کا منہ چڑا رہی تھی جو پلیٹ فارم کے کنارے

کنارے اور بعد میں ریل کی پٹری کے کنارے کنارے بھاگ رہے تھے۔ سنگس مینوں کے کمبین سوار کے چھوٹے چھوٹے ڈربوں کی طرح سطح زمین سے اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ گکٹری آگے چلی جا رہی تھی۔ لیکن ابغن نے ابھی اپنی رفتار تیز نہیں کی تھی کیونکہ وہ ابھی ابھی گودام سے کوئیلہ اور نل سے پانی لے کر فارغ ہوا تھا۔ اور ایک تازہ دم تھے کی طرح گڑگڑا رہا تھا۔ بھکاری چلا رہے تھے۔ بابو۔ صاحب۔ پیسہ۔ بابو۔ صاحب۔ پیسہ۔ گکٹری سفر سے باہر میدان میں آگئی تھی۔ سٹیشن کی عمارت بہت دور پیچھے رہ گئی تھی۔ اور اب یہاں سطح مرتفع یہ گارے کی بنی ہوئی جھونپڑیاں نظر آتی تھیں۔ ان پر کھیرلی کی پھت تھی۔ سوکھیا کی ماری ہوئی جھینڈی میدان میں کھڑی بیگالی کر رہی تھیں۔ اور سورتیاں اور سور آس پاس چر رہے تھے اور اتنی دور سے وہ جھانپتیں کہ بچے معلوم ہونے لگے۔ جو بڑوں میں بدبودار غلیظ گھرا سبز پانی گھرا ہوا تھا۔ اور کہیں کہیں کھائیوں میں

لوگ رفع حاجت کے لئے گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔
 بسک مگلوں کی آٹنہ بار بار کانوں میں آرہی تھی۔ بابو صاحب
 پیسے - بدھ کے وقت میں یہی ہندوستان تھا۔ سہی غلیظ جوہڑ
 یہی گارے کی بھوپڑیاں۔ یہی بھک بنگلے، اشوک کے عہد
 میں بھی یہی ہندوستان تھا۔ اکبر کے عہد میں بھی یہی۔ اور آج
 دس سو سال کی انگریزی حکومت کے بعد بھی لوگ اسی طرح
 گاڑی کی طرف پیٹھ کئے بیٹھے تھے۔ آئے۔ آئے۔ کہیں سے
 آئے۔ وہ زندگی کی بیدار افق۔ اس ساکن بھنڈے بے حس
 دنیا میں۔ اس گہری اٹھانہ نیرنگی میں آئے۔ کہیں سے آئے
 وہ لڑکی کرن، وہ صبح کی سرخ لکیر، محبوب کے پائیل
 کی ناچتی ہوئی آواز۔ آئے کہیں سے آئے۔ اور تاروں
 بھری افشاں کی طرح چمک کر ہندوستان کے ماتھے
 پر جا بٹکا گئے۔۔۔۔۔

چھر گاڑی تیز چلنے لگی۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ تاریکیاں
 شبنمی بادل سے اوڑھ کر چاروں طرف چھا گئیں۔ دل کسی نامعلوم
 خوف اور اداسی سے معمور ہو گئے، سب چیپ تھے۔ صرف
 جگر اک مٹیجیا نہ تبسم سے ادیبوں کی طرف دیکھ کر کہہ رہا تھا۔
 میں اپنے گاؤں جا رہا ہوں۔
 سب خاموش تھے۔

میری بہن بیمار ہے۔
 کوئی نہیں بولا۔

مجھے اپنی بہن سے بڑی محبت ہے۔ مجھے اپنے
 گھر میں سب سے چھوٹی بہن ہی پیاری ہے۔ ہماری ایک
 ہی بہن ہے۔ اور ایک عرصے سے بیمار ہے لیکن یہی اُسے
 چند وجوہات سے اب تک حیدرآباد نہ لاسکا۔

چیپ چاپ..... گاڑی چلتی رہی۔

میں اُسے حیدرآباد لے آؤں گا۔ ڈاکٹر اجکیا سے
 اس کا علاج کراؤں گا۔ ڈاکٹر نائیڈ کو بھی دکھاؤں گا۔

میں نے دو سو روپیہ اس کی بیماری کے علاج کے لئے بچا کے رکھا ہے۔

ہم دونوں کیسے امر و توطیہ کرکھایا کرتے تھے۔ میں اس کے لئے پھین کے گھر سے اٹلی چرا کے لایا کرتا تھا۔ اُسے میٹھے بیر بہت پسند ہیں.....

وہ اپنی یادوں میں کھویا گیا۔ سب لوگ چپ رہے۔

ہولے ہولے کیسے گنگنانے لگا۔ اپنی محزون محبت کا گیت، وہ گیت جس میں اُس نے اپنے کھاتے ہوئے سینے کی آرزوئیں، اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کا نور اور اپنے زرد چہرے کی راکھ کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی۔ وہ ہولے ہولے گارہا تھا۔ جیسے اپنے دل کے بچے کو لوری دے رہا ہو۔ وہ خود اپنے لئے گارہا تھا۔ صرف اپنے لئے

لیکن اُس ڈبے میں کون تھا جس نے اُس گیت کو اپنے لئے
 نہیں سمجھا۔ جسے اُس کے ہر شعر میں۔ ہر مصرعے میں، ہر لفظ میں
 اپنے عشق کی جھلک، اپنی ناکامی کی تصویر اور اپنے محبوب
 کی تصویر نظر نہیں آتی۔ جیسے نقوش میں کوئی مسکرا اٹھا۔
 کسی نے انگریزی کی کہیں سے پائیل بیج اٹھی۔ اور نغمہ
 ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔۔۔۔۔ اک گرا نبار۔ انسر دگی بدعمل
 بنار بن کر سانس روکنے لگی۔ اور پھر ساحر اپنے پیچھے
 زدہ چہرے کے داغوں کو سہلاتا ہوا اپنی سیٹ پر جھک
 گیا۔ اور اپنے ہاتھ ٹھوٹھی پر رکھے ان لغظوں کا ذکر کرنے
 لگا جو اُس نے اپنے محبوب کے پیار کی خاطر لکھے تھے۔ وہ
 نئے جن کی پہنائیوں میں اس کی زندگی لگی، بہاروں کے
 سرچشمے اُبلتے تھے۔ اور جس کے زعفران رنگ کھیتوں
 میں اس کی سرمست آرزوؤں کی مہک تھی۔ ہو لے
 ہو لے آہستہ آہستہ۔ شرمائے ہوئے، مہرمانہ انداز میں
 وہ گارہا تھا۔ گاڑی جتنی تیز تھی۔ گیت اتنا ہی ہو لے

تھا۔ کہیں کوئی صن نہ لے۔ اُس کے پیار کا گیت۔ اس کی
 محبت کی شکست، اس کی زندگی کی موت، لیکن کون اس
 دقت سا حرم تھا۔ پونے کس نے بازار میں نہ بیچے تھے
 کس نے کینی کی طرح اپنے لئے ہر غم کی بھاری سل نہ بانڈھی
 مٹی جن کے بوجھ سے سینہ یوں چُور چُور ہو گیا تھا۔ کس نے
 غم جاناں کی منزل سے گزر کر غم دوراں کو اپنایا نہ تھا۔
 کون تھا جو زخمی نہ رہ چکا تھا۔ محزون نہ رہ چکا تھا۔
 شکستہ دل نہ رہ چکا تھا.....

یہ ایک سبٹ نے آہستہ سے کہا۔ آہستہ سے۔ جیسے
 اپنے الفاظ کو چوم رہا ہو۔ "وہ ہر روز سٹیشن پر ٹن کے
 لئے آتی تھی..... پھر چپ ہو گیا۔"

سب یادوں میں کھو گئے۔ کسی نے کچھ نہیں کہا۔ مگر
 شاید سینکڑوں۔ ہزاروں۔ لاکھوں۔ کروڑوں آدمی ایک
 خاموش گویائی کے ظلم سے مجبور ہو کر وہاں بیان کر رہے
 تھے۔ اپنا نوحہ۔ اپنی حسرتیں۔ اپنی آرزوئیں۔ اپنی مسترتیں

جو وہ تھے ، جو وہ بنا چاہتے تھے ، سُننے جو ادھر سے رہ گئے۔ خوبصورتی ، جسے ہونٹ چوم نہ سکے۔ کسی گم شدہ ماضی کی حسرت۔ کسی نامعلوم مستقبل کی آرزو۔ اور پھر کشمکش حیات کا لہکتا ہوا شعلہ ، تھا ، اب نہیں ہے۔ اب ہوگا۔

ضرور ہوگا۔۔۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔
 سب یادوں میں کھو گئے۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے
 سُننے دیکھنے لگے۔

منزل

یکایک کرشن چندر کی آنکھ کھلی۔ گاڑی ایک چھوٹے سے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ جگر صاحب بستر لیٹ رہے تھے اور سٹیشن پر جانے والے تھے۔ بستر لیٹ کر انہوں نے سوئے ہوئے ادیبوں کی طرف دیکھا۔ اور یکایک کرشن چندر پر ان کی نظر پڑ گئی۔ اور جگر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کرشن چندر نے دیکھا کہ جگر رو رہے ہیں۔

جگر!

جگر نے منہ موڑے ہوئے کہا - چھوٹی بہن مر گئی۔
 کسی نے کرشن چندر کا دل پکڑ لیا۔ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔
 میری چھوٹی بہن مر گئی ہے۔ اب میں اُسے گاؤں
 سے لانے جا رہا ہوں۔ میں نے اس کے علاج کے لئے
 دو سو روپے بچائے ہیں۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔
 اور اس کے لہجے میں نیم دیوانگی تھی۔

وہ چپ چاپ سٹیشن پر اتر گیا۔ پیٹ فارم پر اُس کے
 عزیز کھڑے تھے۔ یکایک اک سنہری رووی میں ملبوس اردلی
 وہاں سے گزرا۔ اُس کے ہات میں دودھ کا گلاس تھا۔ اور
 وہ سر سلطان احمد کے سینیں سیلون کی طرف جا رہا تھا۔ جگر نے
 جلدی میں اُس سے کٹھ کر کھائی اور تھوڑا سا دودھ چھلک
 کر باہر گر گیا۔

دیکھ کر نہیں چلتے ہیں آپ؟ اردلی نے چٹکھا کر کہا
 گارڈ نے سیٹی دی۔

جگر نے آنسو پونچھ کر کہا - "خدا حافظ"

کرشن چندر اُسے خدا حافظ نہ کہہ سکا۔ گاڑی چلنے لگی

ساحر لدھیانوی کرشن چندر کے قریب سیٹ پر لیٹے
تھے۔ کرشن چندر نے آہستہ سے کہا۔ ساحر..... ساحر
ساحر نے اُسی طرح لیٹے لیٹے کہا۔ میں خوب جانتا ہوں
اس شخص کو۔ یہ ابراہیم جلیں کا بھائی ہے۔

کرشن چندر نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ تم
جانتے ہو اس کی چھوٹی بہن مرگئی ہے۔

ہاں میں سن رہا تھا۔ ساحر نے نیچے تکیے پر جھکیں جو
ہر قسم کے جذبات سے عاری معلوم ہوتا تھا کہا۔ میں جانتا
ہوں۔ اُس کی بہن مرگئی ہے۔ اُس کی ایک ہی بہن تھی
سارے گھر میں اُسے وہی سب سے پیاری تھی۔ لیکن
زنی محبت کے باوجود وہ اُس کا علاج اب تک حدر آباد
میں نہ کرا سکا۔ کچھ نیکو اب تک وہ دو سو روپے اکٹھے نہ

نہ کر سکا تھا۔

گم۔ کرشن چندر کہنا چاہا۔ لیکن ساحر نے اسے بھوننے نہیں دیا۔

اور جب اُس نے دو سو روپے اکٹھے کر لئے۔ تو یہ کانفرنس آگئی۔ اور اُس نے یہ روپے کانفرنس کے لئے دیدیئے۔ اور اُس نے گاؤں گاؤں گھوم کر مخدوم کے ساتھ ہرجگہ جا کر چندہ اکٹھا کیا۔ کسانوں سے۔ مزدوروں سے۔ طلباء سے، غریب لوگوں سے چندہ جمع کیا۔ تاکہ کلچر زندہ رہی اُس کی بہن مر جائے لیکن تہذیب زندہ رہے۔ تمدن زندہ رہے۔ فن کار کا خیال زندہ رہے۔ اُس کی بہن بھی خوراک اور مناسب دوا نہ ملنے سے سسک سسک کر جان دیدی لیکن کتاب زندہ رہے۔ زبان زندہ رہے، قوم کی روح زندہ رہے۔ اُس کی پیاری پیاری اُمی کھانے والی، امروہ توڑ توڑ کر چرا کر کھانے والی، اُس کے بچپن کی ساتھی بہن مر جائے لیکن کالیڈاس زندہ رہے۔ غالب زندہ

رہے۔ اقبال زندہ رہے۔ پریم چند زندہ رہے۔ موت
 اُس کی بہن کے ہونٹوں کو بیخ بستہ کر دے اور اُس کی
 آنکھوں کو بے نور کر دے۔ لیکن زندگی اور اُس کا زندہ
 ادب اپنے نور سے اور اپنی حرارت سے اور اپنے ایمان
 سے لاکھوں دلوں کو روشن کر دے۔

مگر... کرشن نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ساحر اب بند
 آواز میں کہہ رہا تھا۔ بہت سے ادیب جاگ اٹھے تھے۔
 کانفرنس کامیاب رہی، مگر اُس کی بہن مرگئی کانفرنس
 کے دوران میں جگر کو اپنی بہن کی شدید علالت کے تین
 ماہ آئے۔ لیکن وہ اُسے لانے نہیں گیا۔ چپ چاپ کانفرنس
 کا کام کرتا رہا۔ جب پہلا شمارہ آیا اُس روز تم اپنا مقالہ
 پڑھ رہے تھے۔ جب دوسرا شمارہ آیا۔ اُس روز تم پریم
 چند سو سائٹی کے مہمان ہو کر ڈنر کھا رہے تھے۔ جب
 تیسرا شمارہ پہنچا۔ تم لوگ راجہ شامراج کے ہاں مدعو تھے...
 ساحر کرشن چندر زور سے چلایا۔ جیسے کسی نے

اُس کے دل میں آہنی کیل گاڑ دی ہو۔ اور پھر جیسے اس
 کیل سے لوہی سرخ دھار پھوٹ نکلی۔ کسی نے اپنی جان
 سے پیاری ہمیشہ کی زندگی کا لوہے کر ادب کو زندہ کر دیا
 تھا۔ لوہی چاروں طرف بہ رہا تھا۔ اور اس میں طلائی صراحیاں
 اور اخروٹ کے میز اور نقرتی پنگ ڈوب رہے تھے۔
 حریری پردے سرک گئے تھے۔ اور دیوار ٹوٹ گئی تھی۔
 جس نے انسان اور انسان کے مابین امتیاز پیدا کر دیا تھا۔
 چاروں مینار سرنگوں تھے۔ اور تیز دوڑتی ہوئی سیاہ
 سیڈان سیاہ نام گھاٹوں کے آگے سر بسجود تھی، وہ لوگ
 اکیلے تھے۔ کینے تھے۔ احساس کمتری اور خود غرضی کے
 شکار تھے۔ لیکن سب مل کے وہ جیسے کچھ اور ہو گئے۔ تھے
 کسی نئی ہمت۔ کسی نئی قوت۔ کسی نئی عظمت سے سرشار
 ہو گئے تھے۔ جیسے مل کے اُن کی برائیاں دب گئی تھیں
 اور اچھائیاں ابھر آئی تھیں۔ ساحراب چپ تھا۔ لیکن
 اس کا سینہ کسی الجھانے طوفان سے رستائیز تھا۔ اس نے

کنکھیوں سے اپنے رفیقوں کی طرف دیکھا۔ کوئی ایسا نہ تھا۔
 جس کی آنکھیں پُر نہ ہوں۔ پُر نہم اور دُور — بہت دُور
 جیسے وہ ماضی اور حال اور مستقبل کے پرے جا کر بھی کچھ تلاش
 کر رہی ہوں۔ کچھ ڈھونڈ رہی ہوں۔ کچھ پار ہی ہوں۔۔۔۔۔
 و آ مق آہستہ سے گانے لگا۔

پورب دیس میں ڈوگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی۔
 بھوکا ہے بنگال
 رے ساتھی

یہ بھوکے بنگال کا گیت تھا۔ اداس دلوں کا گیت تھا۔
 مرتی ہوئی روحوں کا گیت تھا۔ لیکن اس وقت نہ جانے اس
 گیت میں کون سی طاقت آگئی تھی۔ کہ یہ گیت موت کا
 گیت نہیں زندگی کا نعمہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی رے میں
 اداسی کی جھلک نہیں اک کامراں تبسم کی ضوئیں معلوم

ہوتی تھی۔ اس کی پہنائی میں یاس و حسرت نہیں اک پُر امید
 لکار کی گونج سنائی دیتی تھی۔ جیسے اس گیت کا سویا سویا
 مدھم نوحہ کسی کے خون سے جاگ اٹھا تھا۔ اور اک بے خطر
 بغاوتی طوفانی انداز میں کہہ رہا تھا۔

پورب دیس میں ڈگی باجے

ڈگ..... ڈگ..... ڈگ..... ڈگی باج رہی
 تھی۔ پورب دیس ہی میں نہیں۔ پورب۔ اُتر۔ دکن۔ پچھیم۔
 ہندوستان کی چاروں کھونٹوں میں یہ ڈگی باج رہی تھی۔
 ہندوستان کا وہ کون سا گوشہ ہے جو بنگال نہیں!
 وامن کے گاتے گاتے یکایک وہ سب اکیدم اکٹھے
 پوری تڑت سے گانے لگے۔

پورب دیس میں ڈگی باجے بھوکا ہے بنگال رے ساتھی۔

بھوکا ہے بنگال

رے ساتھی !

ساتھی - یہ ڈوگی سن لے - یہ خطرے کی ڈوگی - اک غیر
لتم لکار - اک پیہم پے کار -

آؤ - آؤ - ساتھی

ساتھی جو بھوکے تھے ، ساتھی جو مدقوق تھے ، ساتھی جو
جیل کی سختیوں کے آثار لئے ہوئے تھے ، ساتھی جو
نتظر ہی ہوئی ناکام آرزوؤں کے مزار تھے - ساتھی جو درد
کی تفسیر تھے اب یکایک اٹھ کر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے
اور اپنی روح کی پوری قوت سے گانے گئے - خود ہی
لکار ہے تھے - اور خود ہی سن رہے تھے - اک نیا
گیت - اک نیا خیال ، اک نئی آواز ، اک نیا تبسم - جیسے
ادھ کھلی کھلی یکایک کچھ سوچ کے مسکرا اٹھے

باہر گاڑی بھاگی جا رہی تھی۔ لیکن اندر سکون تھا۔
 باہر چاروں طرف اندھیرا تھا۔ لیکن گاڑی کے اندر روشنی
 تھی۔ باہر راستہ تاریک اور دشوار گزار تھا۔ لیکن اندر
 منزل معلوم ہو چکی تھی۔

کرتشن چندر

